تاج

محمود بنگلوری

گوشۂ ادب لاہور

اُن مزدوروں کے نام

جن کے

خون اور پسینے سے "تاج محل" جیسی بیمثال عمارت تخلیق ہوئی

تِلْكَ آثَارُنَا تَدُلُّ عَلَيْنَا
فَانْظُرُوا بَعْدَنَا إِلَى الْآثَارِ

— یہ ہماری نشانیاں ہیں جو ہماری طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ اس لیے
ہمارے بعد ہماری ان نشانیوں کو دیکھو۔

عنوان

مکرم ۔ السلام علیکم

مجھے آپکی اس تجویز سے اتفاق ہے کہ 'دیوان مہندس' کو شائع کر دیا جائے تاکہ یہ فنا ہو جانے سے بچ جائے ۔ ورنہ بظاہر اسکا کوئی دوسرا نسخہ معلوم نہیں ہوتا ۔ یہ آپکی بڑی خدمت ہوگی ۔ بہرحال آپ نقل تو لے لیں تاکہ اگر یہ ہندوستان سے باہر بھی جائے یا کسی غیر مستحق کے صندوق میں بند ہو جائے تو اس کا دوسرا نسخہ تو مل سکے ۔

والسلام

سید سلیمان ندوی

۲۳ شعبان ۱۳۶۲ ھ

در فنِ تعمیرِ مردانِ آزاد

از علامہ اقبالؒ

یک زماں با رفتگاں صحبت گزیں — صنعتِ آزاد مرداں ہم ببیں

خیز و کارِ ایبک[1] و سوری[2] نگر — وا نما چشمے اگر داری جگر

خویش را از خود بروں آوردہ اند — ایں چنیں خود را تماشا کردہ اند

سنگ ہا با سنگ ہا پیوستہ اند — روزگارے را بآنے بستہ اند

دیدنِ او پختہ تر سازد ترا — در جہانِ دیگر اندازد ترا

نقش سوئے نقش گر می آورد — از ضمیرِ او خبر می آورد

ہمت مردانہ و طبع بلند — در دلِ سنگ ایں دو لعلِ ارجمند

سجدہ گاہ کیست ایں از من مپرس — بے خبر! روداد جاں از تن مپرس

وائے من از خویشتن اندر حجاب — از فراتِ زندگی ناخوردہ آب

---

[1] ایبک: قطب الدین ایبک ۔ [2] سوری: شیر شاہ سوری ۔

وائے من از بیخ و بن بر کندۂ　　　از مقامِ خویش دور افگندۂ
محکمی ہا از یقینِ محکم است　　　وائے من شاخِ یقینم بے نم است

در من آں نیروے الا اللہ نیست
سجدہ ام شایانِ ایں درگاہ نیست

یک نظر آں گوہرِ نابے نگر　　　تاج را در زیرِ مہتابے نگر
مرمرش ز آبِ رواں گردندہ تر　　　یک دم آنجا از ابد پایندہ تر
عشقِ مرداں سرِ خود را گفتہ است　　　سنگ را با نوکِ مژگاں سفتہ است
عشقِ مرداں پاک و رنگیں چوں بہشت　　　می کشاید نغمہ ہا از سنگ و خشت
عشقِ مرداں نقدِ خوباں را عیار　　　حسن را ہم پردہ و ہم پردہ دار
ہمتِ او آں سوئے گردوں گذشت　　　از جہانِ چند و چوں بیروں گذشت

زانکہ در گفتن نیاید آنچہ دید
از ضمیرِ خود نقابے بر کشید

از محبت جذبہ ہا گردد بلند　　　ارج می گیرد ازو ناارجمند
بے محبت زندگی ماتم ہمہ　　　کاروبارش زشت و نامحکم ہمہ
عشق صیقل مے زند فرہنگ را　　　جوہرِ آئینہ بخشد سنگ را
اہلِ دل را سینۂ سینا دہد　　　با ہنرمنداں یدِ بیضا دہد
پیشِ او ہر ممکن و موجود مات　　　جملہ عالم تلخ و او شاخِ نبات
گرمیِ افکارِ ما از نارِ اوست　　　آفریدن جاں دمیدن کارِ اوست
عشق مور و مرغ و آدم را بس است　　　عشق تنہا ہر دو عالم را بس است

دلبری بے قاہری جادوگری است دلبری با قاہری پیغمبری است
ہر دو را در کار ہا آمیخت عشق
عالمے در عالمے انگیخت عشق

(ماخوذ از بوعجمیہ)

مقدمہ

دنیا میں وہی قوم خلافت الٰہیہ کی مستحق سمجھی جاتی ہے جس کے ارادوں میں بندآہنگی اور استقامت جس کے ہر کام میں تندہی اور جفاکشی اور کیریکٹر میں پختگی و صلاحیت ہوتی ہے۔ ان صفات کے ساتھ ساتھ اس کی جنگی قوت اس کا قانون اور انصاف پروری ایسے اصول ہیں جو اس کو دنیا میں کامیاب رکھتے ہیں اور جب تک ایک قوم ان اعلیٰ خصائل سے متصف رہتی ہے اُس وقت تک فیضانِ الٰہی بھی اس کا ساتھ دیتا ہے اور قوم میں وہ وہ جوہر پیدا ہوتے ہیں جو اپنے اعلیٰ اخلاق۔ علم و فن۔ صنعت و ایجاد اور دل و دماغ سے اس کی تہذیب و تمدن کو مالامال کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب بھی قوم دولت و نعمت کی فراوانی سے طغیان پر اُتر آتی ہے اور تندہی۔ جفاکشی اور

اعلیٰ کیریکٹر کو چھوڑ کر کاہل، سست، عیش و آرام کی دلدادہ اور خصائل رذیلہ کو اختیار کر لیتی ہے تو قدرت بھی اپنی سرپرستی سے دستکش ہو جاتی ہے اور اس قوم پر زوال آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ قوم دنیا سے مٹ جاتی ہے اور صرف اس کی چھوڑی ہوئی نشانیاں آنے والی نسلوں کی عبرت کے لئے باقی رہ جاتی ہیں۔"

محمودؔ

اگر عرب کے ہنرور اور صناع اپنی یادگاریں نہ چھوڑتے تو آج عربی تہذیب و تمدّن کا پتہ بھی نہ لگتا۔ ہندوستان کے عالی شان مندروں اور محلات کے بنانے والے اپنے دل و دماغ سے کام نہ لیتے تو آج یہ معلوم بھی نہ ہوتا کہ اس ملک میں بھی کسی زمانے میں ایک شاندار تمدّن تھا۔ اسی طرح ہندوستان کے اسلامی دور میں "قطب" جیسا عظیم الشان مینار، "تاج محل" جیسا خوبصورت مقبرہ اور "موتی مسجد" جیسی جاذب نظر عبادت گاہ نہ بنتی تو آج کون کہہ سکتا کہ مسلم ہندی بھی ایک محیّر کن ماضی کا مالک تھا۔

اس وقت جب دنیا تاریک سے تاریک تر ہو رہی تھی اور قدیم تمدن و مذاہب دم توڑ رہے تھے اور فرزندانِ آدم اپنے پیدا کرنے والے کو چھوڑ کر اپنے ہی ہاتھوں کے بنائے ہوئے معبودوں کی پرستش کر رہے تھے تو اس وقت عرب سے ایک سیلابِ رحمت اٹھا۔ جو اپنے جلو میں تمام دنیا کے لئے ایک حیاتِ نو کا پیغام لے کر آیا۔ یہ سیلِ آب افریقہ کے بے آب و گیاہ میدانوں کو چیرتا ہوا مغرب میں اُندلس کو سرسبز بنانے کے لئے پہنچا اور پھر مشرق میں ساسانیوں و ایرانیوں کے آتشکدوں کو بجھاتا ہوا ہندوستان کی اس

سرزمین کو جو باوجود دریائے گنگا و سندھ کے العطش العطش پکار رہی تھی سیراب کرنے کے لئے آیا۔ عربوں نے سندھ پر چڑھائی کی۔ لیکن چند سال بعد ہی انہیں واپس جانا پڑا۔ اس کے تین سو سال بعد محمود غزنوی اور شہاب الدین محمد غوری وہی پیغام حیات لے کر آئے جو عربوں نے ملک سندھ اور دوسرے ملکوں کو دیا تھا۔ دہلی پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ ہندوستان ان کے زیرِ نگیں تھا۔ غزنوی ہو یا غوری دونوں ترک تھے اور یہ ترک اسی تمدن کے خوشہ چین تھے جو عربی تمدن کہلاتا ہے۔ غوری کی اچانک وفات (شہادت) کی وجہ سے قطب الدین ایبک جو غوری کا ایک ترکی النسل غلام تھا۔ ہندوستان کا پہلا شہنشاہ ہوا۔ مسلمانوں کی عظمت و شوکت کی دھاک بٹھانے اور فتوحات کا شکرانہ ادا کرنے کے لئے اس شہنشاہ نے محلات اور قصر نہیں بنائے۔ اپنے لئے مقبرہ نہیں بنایا۔[1] اس نے اس صنم کدے میں جہاں لاکھوں صنم پوجے جا رہے تھے۔ خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کے لئے ایک عالی شان عبادت گاہ کی بنیاد ڈالی جس کا نام "مسجد قوۃ الاسلام" ہے اور جس کا عظیم الشان مینار "قطب مینار" کے نام سے نو سو برس کے بعد بھی ان جفاکش صحرا نشینوں کی یاد دلاتا ہے جو ترکستان کے تپتے ہوئے ریگستانوں کو چھوڑ کر اعلائے کلمۃ الحق کے لئے

---

[1] حضرت حفیظ جالندھری مصنف شاہنامہ اسلام لکھتے ہیں کہ اس شہنشاہ کی تربت ایسی جگہ ہے کہ کوئی جانتا بھی نہیں۔ لاہور میں انارکلی بازار سے جو راستہ میو ہسپتال کو جاتا ہے۔ ایک کوچے کے بڑے مکان کی دیوار میں ایک تربت ہے۔ جہاں ایک پتھر پر کندہ ہے: "یہ ہے آخری آرام گاہ سلطان قطب الدین ایبک کی جو چوگان کھیلتا ہوا گھوڑے سے گرا اور مر گیا۔ تاریخ وفات ۱۲۱۰ھ"

(شاہنامہ اسلام جلد اول صفحہ ۱۴۱)

ان صنم کدے میں آئے تھے۔ اس کے بعد ہی تعمیرات کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جو اسلامی دور کے خاتمہ تک برابر چلا جاتا ہے۔

ابتدائے آفرینش سے دنیا میں جس قدر قومیں بھی آئیں۔ انہوں نے اپنے اپنے مذاق و ماحول کے مطابق اپنی زندگی کو بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج پر پہنچانے کے لئے علوم و فنون، صنعت و حرفت۔ زراعت و تجارت۔ آرٹ اور تعمیرات پر توجہ کی۔ دَر جہاں ان کی یادگاریں مختلف قسم کی ہیں۔ ان میں تعمیرات کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ ان تعمیرات کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ نمایاں ہونے کے علاوہ دیرپا بھی ہیں اور دیکھنے والوں پر ایک خاص اثر ڈالتی ہیں۔ صولت و شوکت اور مذاقِ زندگی کا اظہار جس قدر ان تعمیرات سے ہوتا ہے۔ وہ علوم و فنون کی کسی دوسری شاخ سے نہیں ہوتا اور شاید یہی وہ جذبہ ہے۔ جو ہر قوم کے دل میں پرورش پاتا رہا ہے اور شاید اسی ہی لئے بابل ہو یا نینوا۔ ایران ہو یا مصر۔ چین ہو یا ہندوستان ہر جگہ تعمیرات پائی جاتی ہیں اور یہی تعمیرات ان کے تمدن کی یادگاریں مانی جاتی ہیں۔ لہذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ عربوں نے اپنے مفتوحہ ممالک شام۔ مصر اور اندلس میں اسی جذبہ سے کام لیا تھا۔ لیکن ایک مسلمان کی زندگی میں چونکہ مذہب کو اولیت حاصل ہے۔ لہذا اس کی تعمیرات نے زیادہ تر مذہبی صورت اختیار کر لی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ مسجدیں اس کثرت سے نظر آتی ہیں اور یہ سبق ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ ایک مسلمان، حکومت۔ دولت اور ثروت کے نشہ میں بھی اپنے دین سے غافل نہیں ہوتا۔

حکومت اور دولت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ یہ لازمی امر تھا کہ علوم و فنون بھی ترقی کریں۔ خصوصاً جبکہ شارع اسلام نے ان پر خاص توجہ دلائی تھی۔ عرب نے اس تعلیم سے

پورا فائدہ اٹھایا۔ شام مصر اور اندلس کی تعمیرات اسی تعلیم کے مظاہر ہیں۔ صناعی کے جو بہترین نمونے ان ملکوں میں نظر آتے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ اسلام کے حیطۂ تعلیم کے اندر فنونِ لطیفہ کی عظمت کو قائم رکھنے کے لئے عربی معمار و صناع کس طرح ایک نئے جمالیاتی نظریہ کی تخلیق کا باعث ہوئے جو آج دنیا میں سب سے زیادہ جاذبِ نظر اور شاندار تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا آج تک یونان کی دیویوں کے سربان مجسمے یا غار ہائے ایلورا کے سنگین بت یا اجنٹا کی تصاویر کا جواب پیدا نہ کر سکی۔ ان کے بنانے والوں نے صنم پرستی کے جوش میں اپنے کمال فن کو انتہا تک پہنچا کر ایک جانب اگر اپنی روحانیت کا ثبوت دیا ہے تو دوسری جانب ترغیب جلنبی اور صنم پرستی کی تحریک کو بھی درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ بخلاف اس کے اسلامی معماروں و صناعوں نے عمارتوں میں گل بوٹے خطاطی اور مظاہر قدرت کے بے نظیر نمونے پیش کر کے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ آرٹ صرف صنم پرستی یا ترغیب جلنبی تک محدود نہیں رہ سکتا۔ روحانیت کا سبق گل بوٹوں سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ ع

"ہر ورقے دفتر لیست معرفت کردگار"

ہندوستان کی اسلامی تعمیرات میں یہی جذبہ شروع سے آخر تک پایا جاتا ہے۔ ان تعمیرات کے دیکھنے والوں پر بیک نظر ثابت ہو جاتا ہے کہ اس فن کو ہندوستان میں کس طرح عہد بہ عہد ترقی ہوئی اور وہ کس طرح شاہجہان کے زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ یقیناً تاج محل کو جن آنکھوں نے دیکھا ہے۔ وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ فن اپنے درجۂ کمال کو پہنچ گیا ہے تاریخ ہند کی یہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ جن ہنروروں۔ معماروں اور صناعوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے ہندوستان میں اسلامی تمدن کے آثار قائم کئے۔ ان کے ناموں

اور تذکروں سے بہ یکسر خالی ہے۔ دنیا کے اور ملکوں کی تاریخیں اپنے پڑھنے والوں کو موجدوں صناعوں اور معماروں کے نام سے نہ صرف واقف کراتی ہیں بلکہ ان کا ذکر نہایت ادب و احترام سے بھی کرتی ہیں۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو قوم اور اس کے تمدن کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے ہندوستان کی تاریخ صرف بادشاہوں کے تذکروں پر ختم ہوتی ہے اور پڑھنے والے پر یہ اثر ڈالتی ہے کہ انہوں نے سوائے خونریزی یا عیاشی کے اور کچھ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان کا مسلمان یہ نہیں جانتا کہ اس ملک میں کبھی اس کا بھی ایک شاندار تمدن تھا یا اگر اس کا کچھ دھندلا سا خاکہ اس کے دماغ میں ہے تو وہ اس سے ناواقف ہے کہ اس تمدن کے بانی کون اور کیا تھے۔ وہ لال قلعہ۔ موتی مسجد اور تاج محل جا کر دیکھتا ہے اور ان کی خوبصورتی سے مسحور ہو جاتا ہے لیکن کبھی اس کو یہ خیال نہیں آتا کہ ان کے معمار و صناع اس کے ہی اسلاف تھے اور وہ کس پایہ کے صاحب کمال تھے۔ اس کو وہ اچھی طرح جانچنے کی صلاحیت بھی کھو چکا ہے

تعمیرات کی فہرست سے ثابت ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں کس قدر تعمیرات کیں اور ان سے کس حیرتناک تمدنی ترقی کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن بقول ایک مورخ کے "یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر ہندوستان میں مغل حکمران نہ ہوتے اور خصوصاً صاحب قرانِ ثانی محمد شہاب الدین شاہ جہان جیسا عمارت گر شہنشاہ ہندوستان کو نصیب نہ ہوتا تو آج دوسرے مسلمان حکمرانوں کی بنائی ہوئی عمارتیں تاریخِ عالم میں فنِ تعمیر کے لحاظ سے کوئی امتیاز حاصل نہ کر سکتیں۔"

"شاہ جہان نے کئی عمارتیں بنوائیں۔ جن میں سے ایک سے ایک خوبصورتی میں بڑھکر ہیں۔ لیکن ان سب میں تاج محل جو اس کی محبوب ملکہ ارجمند بانو بیگم (ممتاز محل) کا مقبرہ

ایک ایسے نادر ترین تخیل اور نازک ترین جذبہ کا مظہر ہے جس کا جواب دنیا اب تک پیدا نہ کر سکی۔ کہا جاتا ہے کہ بیگم نے بستر مرگ پر اپنے تاجدار شوہر کو وصیت کی تھی کہ اس کا مقبرہ ایسا بنایا جائے جو دنیا میں بے مثل ہو۔ "تاج" اسی وصیت کی تکمیل تھی۔

شاہ جہان کے پاس پاکیزہ تخیل کے علاوہ حکومت تھی۔ زر و جواہر تھے۔ روپیہ تھا لیکن ان سب کو بروئے کار لانے یعنی عمارت میں متشکل کرنے کے لئے ایسے ہی با کمال صناعوں کی ضرورت تھی جو اسی قدر حسین تخیل کے حامل ہوں اور شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ ہندوستان کی اس نامور ملکہ "ممتاز محل" کی آخری آرامگاہ دنیائے تعمیرات کا وہ لاجواب شاہکار ہو جس کو دیکھ کر ان قصرات مشیدہ کی یاد تازہ ہو جائے جنہیں حیات بعد الممات میں خدا نے اپنے نیک بندوں کو دینے کا وعدہ کیا ہے اور "تاج" کو دیکھ کر یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے معمار بھی اسی فردوسی تخیل کے حامل تھے۔ جس نے "بے بدل خان" کو ملائکہ کی زبان سے ملکہ کی تاریخ وفات

"جائے ممتاز محل جنت باد"

لکھنے پر آمادہ کیا تھا۔

ملکہ کا مقبرہ تیار ہو گیا۔ شاہ جہان کی یادگار قائم ہو گئی۔ ملکہ اور شہنشاہ کا نام ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گیا۔ مزدور گمنام رہ گئے۔ حضرت علامہ ڈاکٹر سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ نے بالکل سچ لکھا ہے کہ:۔

"ہندوستان کے ارباب کمال میں خدا جانے کتنی ہستیاں ہیں جو گمنامی کے پردہ میں اس طرح چھپی ہوئی ہیں کہ آج ہزار تلاش اور جستجو پر بھی ان کا سراغ نہیں لگتا۔ اس ملک میں تاریخ نویسی کا رواج بہت کم تھا۔ گو مسلمانوں کے آنے کے بعد تاریخ

کی کچھ کچھ روشنی یہاں پھیلنے لگی۔ پھر بھی بادشاہوں کے ایوان تاریخ سے باہر بدستور اندھیرا چھایا رہا۔ شاعروں نے البتہ اپنے تذکروں کی محفل میں شمع جلائی۔ مگر اس کی روشنی اتنی مدھم ہے کہ خود ان کی صورتیں اس سے اچھی طرح یہاں میں نہیں آتیں۔ روحانی بزرگوں کے مزاروں پر بھی چراغ جلائے گئے ہیں مگر ان سے بھی تبرکات اور کرامات کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اگر ملا بدایونی۔ شاہ عبدالحق دہلوی اور آزاد بلگرامی نہ ہوتے تو جو کچھ بھی معلوم ہے وہ بھی معلوم نہ ہو سکتا۔

لاہور کے جس ھندسی خاندان کا حال آج ہم کو سنانا ہے۔ افسوس ہے کہ تاریخوں میں نام کے سوا اس کے کسی رکن کا حال بھی مجھے معلوم نہیں ہوا۔ حالانکہ ان کی بنائی ہوئی عمارتیں۔ تاج آگرہ۔ لال قلعہ اور جامع مسجد دہلی ہمیشہ سے مشہور روزگار ہیں مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ جن باکمالوں نے فن کی ندرت کا یہ کمال دکھایا ہے۔ کاغذ کے پرانے اوراق میں بھی ان کا نام و نشان نہیں ملتا۔

شاہ جہان کی تاریخوں میں اس کے سال ششم میں روضہ تاج محل کے بننے کا پورا حال ایک ایک چیز کی پیمائش کے ساتھ لکھا ہے مگر جن نادرہ کار ھندسہ دانوں نقاشوں اور طراحوں نے اس کا خاکہ کھینچا اور جن معماروں نے اس کو بنا کر تیار کیا۔ ان غریبوں کے نام تک بھی ان اوراق میں جگہ نہ پا سکے اور آج کل کے محققین بڑی چھان بین کے بعد بھی ان کا پتہ لگانے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔

تاریخوں اور تذکروں کی اس افسوسناک بے مائگی اور تہی دستی نے جہاں ہماری تمدنی

تاریخ پر اثر پڑا ہے۔ یہاں بہتان طرازی اور جھوٹی روایات کے لئے بھی دروازہ کھول دیا
ہے۔ انگریزی میں ایک کتاب دیکھی جس کا نام "وہن کنگز روڈ ٹو دہلی" When Kings
Rode to Delhi ہے اس کا یورپین مصنف لکھتا ہے :-

"اس عمارت تاج کے مکمل ہو جانے پر شاہ جہان نے اس کے انجینیر کی آنکھیں
نکلوا دیں تاکہ وہ اس قسم کی عمارت کہیں اور نہ بنا سکے۔"

ایک اور مصنف "سباسٹین مانریک" جو پادری بھی ہے کہ تاج کی تعریف ایک اطالوی
جوہری نے کی جس کا نام "جیرونیمو وریونس" Geronimo Vervineo تھا۔ ایک
اور مغربی مصنف نے "آگسٹین ڈی بورڈو" (Augustin De-Bourdeau
ایک فرانسیسی کا نام پیش کیا ہے۔ ناموں کا یہ اختلاف خود ظاہر کرتا ہے کہ ان لکھنے والوں
کے پاس کوئی مستند شہادت نہیں ہے۔ صرف تاج کی لاثانیت کو دیکھ کر ہر مغربی مصنف
یہ چاہتا ہے کہ اس کی تعمیر کا سہرا اس کے اپنے ملک کے سر باندھے۔ اگر حقیقت میں تاج
کی تعمیر یورپین صناعوں کی رہین منت ہوتی تو ٹورنیر، برنیر اور منوکی فرنگی سیاح جو شاہ جہاں
کے زمانہ میں ہی ہندوستان آئے ہوئے تھے، اپنی اپنی کتابوں میں ضرور اس کا ذکر کرتے
برخلاف اس کے وہ تاج کو ہندوستانی صناعوں کی تعمیر قرار دیتے ہیں اور موسیو تینو نو
Mons. Tinino نے بھی یہی لکھا ہے :-

"یہ عجیب و غریب عمارت اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ ہندوستان کے باشندے فن تعمیر
سے نابلد نہیں ہیں۔ اگرچہ طرز تعمیر یورپ کے لئے اجنبی ہے۔ یہ اعلیٰ مذاق ہے اور یونانی
یا دوسرے قدیم فن سے متمیز رہے۔ دیکھنے والا بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ بہت ہی نفیس
نمونہ تعمیر ہے۔"

(معارف جنوری ۱۹۲۱ء)

اور یہ بھی ایک حقیقت اور عام نظریہ ہے کہ غیر ممالک کے ماہرین فن کو اس لئے طلب کیا جاتا ہے کہ ان کے ملک کی چیز یہاں بھی تیار کی جائے ۔ اس نظریہ کے تحت اگر دیکھا جائے تو یورپ میں اس طرز کی ایک عمارت بھی نہیں ہے ۔ بلکہ بخلاف اس کے ایشیا کی بہت سی اسلامی تعمیرات میں تاج کی مشابہت پائی جاتی ہے ۔ معارف جنوری ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر عبداللہ صاحب چغتائی نے لکھا ہے :-

(۱) تاج کی عمارت ان اسلامی عمارات سے بالکل مشابہت رکھتی ہے جو شیراز اور سمرقند میں پائی جاتی ہیں ۔

(۲) تاج کا گنبد ایرانی طرز کا ہے جو ایرانی عمارتوں میں پائے جاتے ہیں

(۳) بغداد کی جامع مسجد میں جو کہ ابو جعفر عباسی کی بنا کردہ ہے ۔ اسی قسم کا بلب نما گنبد نظر آتا ہے ۔

(۴) تیمور کے مقبرہ کے گنبد کی اندرونی بناوٹ اور ساخت بالکل تاج کے گنبد سے ملتی جلتی ہے ۔

(۵) ترکستان میں تیمور کی مسجد بھی تاج ہی کے مشابہ ہے ۔"

ممکن ہے کہ تاج کی پرچین کاری کو دیکھ کر یورپین مصنف اس کو اطالوی صناعوں کا کارنامہ قرار دیتے ہوں ۔ چنانچہ اس کے متعلق بھی ڈاکٹر عبداللہ صاحب چغتائی نے لکھا ہے ۔

" تاج میں پرچین کاری کا کام جو پایا جاتا ہے ۔ اس کی بنا پر بعض یورپین مورخین کا خیال ہے کہ یہ صنعت اطالوی صناعوں کا کارنامہ ہے ۔ چنانچہ ڈاکٹر فرگسن اپنی تاریخ میں صفحہ $\frac{306}{2}$ پر تحریر کرتے ہیں ۔

" ابتدائے ۱۷ صدی عیسوی میں اطالوی حسن کار خصوصیت سے فلورنس سے

ہندوستان میں لائے گئے اور یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندوستانیوں کو سنگ مر مر میں کھود کر پرچین کاری کرنا اور اس میں قیمتی پتھر بھرنا سکھایا۔"

لیکن مسٹر براؤن اس کی تردید میں لکھتا ہے :-

"اگرچہ ہندوستان میں مغلیہ خاندان کے دو آخری بادشاہوں کے زمانہ میں اطالوی حسن کار خدمت میں تھے مگر کوئی خاص شہادت نہیں کہ وہ کسی اعلےٰ منصب پر سرفراز تھے جبکہ حسن کارانِ شیراز۔ بغداد۔ سمرقند اور قنوج جو اپنے فن میں بہت ماہر اور کامل تھے۔ دورانِ تعمیر تاج میں موجود تھے۔ بہت ممکن ہے کہ تاج محل کی علی مردان خان نے طرح ڈالی ہو۔"[1]

اس اطالوی نظریہ کی تردید میں سر جارج برڈ وڈ اپنی کتاب انڈین آرٹس میں لکھتے ہیں:

"تاج کی پرچین کاری ہرگز فلورنس کی طرز کی نہیں ہے بلکہ ہندوستانی مغل زمانہ کی پسندیدگی کے مطابق ہے۔ شاہ جہان شہنشاہ ہند کے علاوہ کسی دوسرے غیر ملکی حسن کار کے علم اور ذوق کا ہرگز ہرگز نتیجہ نہیں ہے۔"

اس کی تائید میں سر جان مارشل اپنی رپورٹ ۱۹۰۳ء میں مانڈو کے بیان میں لکھتے ہیں:-

"پرچین کاری معمولی میں بہ نسبت اس کے جو آج تک معلوم ہوئی ہے۔ روضۂ خلجی مانڈو وسط ہند میں ملی ہے۔ اس کو اطالوی فن قرار دینا ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ محمود خلجی جس کی یاد میں یہ روضہ بنایا گیا۔ ۱۴۷۵ء میں فوت ہوا تھا۔"

---

[1] یہ اگرچہ درست ہے کہ علی مردان خاں بہت بڑا مہندس وقت تھا مگر اس کا تاج کے نقشہ سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ یہ ہندوستان میں ۱۶۳۷ء میں آیا جبکہ تاج کی عمارت کو شروع ہوئے ۸ سال ہو چکے تھے۔

ان اقتباسات سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ تاج کی پرچین کاری میں بھی کسی غیر ملکی کا ہاتھ نہیں ہے۔

بہرطور معماران تاج کی اس گمنامی نے جس طرح متعصب مغربی مورخوں اور سیاحوں کو تاج کی تعمیر کو یورپ سے نسبت دینے کی جرأت دی۔ اسی طرح ہندستان میں بھی جھوٹی روایات کی تشہیر میں بہت بڑی معاون ثابت ہوئی۔ اسی سلسلے میں حضرت علامہ ڈاکٹر سید سلیمان صاحب ندوی نے ایک فارسی رسالے کا پتہ لگایا ہے وہ لکھتے ہیں:-

"تاج محل کے حالات میں بعہد انگریزی آگرہ میں ایک فارسی رسالہ خدا جانے کس نے لکھا ہے۔ اس کے قلمی نسخے عموماً ملتے ہیں۔ اس میں حالات کے ساتھ ساتھ عمارات کی تصویریں بھی ہیں۔ شروع میں ممتاز محل کی وفات کی افسانہ نما کیفیت لکھی گئی ہے اور پھر اس میں تاج محل کی تعمیر کا ایک ایک خرچ اور اس کے ایک ایک پتھر کی قیمت، اور اس کے ایک ایک کاریگر کے نام مع تعین تنخواہ لکھے ہیں جو زیادہ تر سنی سنائی حکایتوں اور فرضی اعداد پر مشتمل معلوم ہوتا ہے۔ اس رسالہ میں کاریگروں میں سب سے پہلا نام "استاد عیسیٰ نادر العصر نقشہ نویس ساکن روم" لکھا ہے۔ اس کتاب کے مختلف نسخے دیکھے اور سب میں ناموں کا کچھ نہ کچھ اختلاف پایا اور سب سے عجیب بات یہ ہے۔ کہ اس میں ہندو کاریگروں تک کو ساکن روم و بلخ و قندھار و سمرقند لکھا ہے جامعہ علی گڈھ۔ حیدرآباد۔ بھوپال۔ ندوہ اور دارالمصنفین کے کتب خانوں کے نسخوں میں اور ان کے علاوہ اور بھی اس کے جو نسخے نظر سے گذرے ان میں بھی یہ شنشر گربگی موجود ہے۔ استاد نادر العصر تک تو نام صحیح ہے۔ جو اسی

احمد معمار کا شاہی لقب تھا مگر اس میں عیسیٰ نقشہ نویس ساکن روم کا نام اضافہ ہے یا یہ کہ "استاد نادر العصر اور عیسیٰ ساکن روم" دو نام ہیں جو آپس میں مل گئے ہیں۔ اس کتاب تاج میں امانت خان شیرازی کے سوا جس کا ذکر تاریخوں و تذکروں کے علاوہ خود تاج کے کتبوں میں ہے۔ جن کاریگروں کی فہرست دی گئی ہے اور جو تنخواہیں لکھی گئی ہیں۔ وہ تمام تر محتاج ثبوت ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ تاج کے مورخین حال نے بھی ان کو بے چون وچرا تسلیم کیا ہے۔"

اس فارسی رسالہ کے بعد وہ اردو لٹریچر ہے جو تاج کے متعلق ہندوستان میں شائع ہوا ہے ان میں سوائے امانت خاں شیرازی کے جس کا نام تاج کے کتبوں میں ہے۔ باقی جو نام دیئے گئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی رسالہ سے ماخوذ ہیں۔ البتہ اتنی احتیاط ضرور کی گئی ہے کہ ہندو کاریگروں کی وطنیت ہندوستان ہی کی بتائی گئی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے جو نام دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو ان ملکوں میں مروج نہیں ہیں بہرطور میری یہ رائے ہے کہ ممکن ہے کہ ان فہرستوں میں جو نام دیئے گئے ہیں۔ ان میں کچھ صحیح بھی ہوں جو روایتاً سینہ بہ سینہ چلے آئے ہوں۔ مثال کے لئے استاد عیسیٰ آفندی کا نام پیش کیا جاتا ہے ممکن ہے کہ استاد عیسیٰ کوئی انجینیر ہو جو تاج کی تعمیر* میں شریک تھا لیکن اس کا کوئی ثبوت

---

* چند مغربی مصنفین نے دعویٰ کیا ہے کہ استاد عیسیٰ یورپین تھا اور اس کا اصلی نام [illegible] ڈی بورڈو تھا۔ چونکہ وہ مذہباً عیسائی تھا۔ اس لئے ان مغربی مصنفین کا کہنا ہے کہ ہندوستانیوں نے اس کا نام عیسیٰ رکھ دیا لیکن جدید تحقیقات نے اس کو غلط قرار دیا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ محمد عیسیٰ نامی ایک ترکی انجینیر تھا۔ جو شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آیا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ اور انجینیروں کی طرح وہ بھی تاج کی تعمیر میں شریک ہو۔

نہیں ملتا کہ تاج کی تخلیق کا سہرا اس کے سر ہے یا اس کو شاہ جہان کی جانب سے "نادر العصر" کا خطاب ملا تھا۔ ملا مرشد شیرازی۔ یہی حجت آصف خان۔ میر عبدالکریم۔ محمد حنیف بغدادی کے متعلق بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ بے شک ان معماروں کے نام معاصر تاریخوں میں آتے ہوئے ہیں۔ میر عبدالکریم کے متعلق شک نہیں کہ اس کے زیر اہتمام لاہور کا قلعہ تیار ہوا تھا۔ اس کا نام اس قلعہ کے دروازے پر کتبہ میں پایا جاتا ہے۔ خافی خان نے لکھا ہے کہ حکومت خاں کے زیر اہتمام دہلی کا قلعہ تیار ہوا تھا۔ محمد حنیف بغدادی کے متعلق ایک تحریر میں ہے کہ "تاج" کی تعمیر کا اہتمام اس کے ذمہ تھا۔ لیکن یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ تاج اور لال قلعہ کی بنیاد یعنی تخلیق ان انجینیروں میں سے کس نے کی تھی۔ اہتمام کرنا ایک اور کام ہے اور تخلیق یعنی نقشہ بنانا ایک اور چیز ہے۔ لہٰذا اب جو سند پیش کی جاتی ہے۔ وہ اس کا ناقابل تردید ثبوت پیش کرتی ہے کہ "تاج" آگرہ اور "لال قلعہ" دہلی کی بنیاد کا سہرا ایک اور ایک ہی انجینیر کے سر ہے جس کو تاج اور لال قلعہ کی تخلیق کے صلہ میں "نادر العصر" کا خطاب ملا تھا اور وہ شاہ جہان کا چیف انجینیر بھی تھا۔[1]

یہ تاریخ کی خوش قسمتی ہے کہ "تاج" کی تعمیر کے قریباً تین سو سال بعد ایک ایسی دستاویز دریافت ہوئی ہے جو اس کے معماروں کے مستند حالات سے دنیا کو آگاہ کرتی ہے۔ اس میں سے اب جو نام سب سے زیادہ اہمیت اور سند رکھتا ہے۔ وہ "استاد احمد لاہوری" کا ہے جس کو

---

[1] احمد کی شخصیت شاہ جہانی عہد کی کوئی غیر مشہور شخصیت نہیں ہے۔ شاہ جہان کی ہم عصر تاریخوں میں اس کا نام نہایت عزت سے لیا گیا ہے بلکہ اس کو اور اس کے بھائی حامد کو جیسا کہ علامہ ڈاکٹر سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کے مضمون سے واضح ہوگا۔ اس کو "سرآمد معماران نادرہ کار" اور شاہ جہان کے "معمار کل" کے خطاب سے یاد کیا گیا ہے۔ سرآمد اور معمار کل کے خطابوں سے صاف ثابت ہے کہ [illegible]

شاہ جہان کی طرف سے "نادر العصر" کا خطاب ملا تھا۔ تاج کی تعمیر میں اس کے تینوں بیٹے (۱) عطاء اللہ رشیدی (۲) لطف اللہ احمد (۳) نور اللہ اور احمد کا بھائی حامد بھی شامل تھے۔ یہ احمد ہی تھا جس نے تاج کی طرح اور بنیاد رکھی اور پنجاب کے مشہور شہر لاہور کو اس کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ دہلی میں شاہ جہان کے بنائے ہوئے بازار دریبہ کلاں کے پاس ان کا بسایا ہوا "کوچہ استا احمد" اب تک یادگار چلا آتا ہے۔

اب اخیر میں، میں ایک اور غلط فہمی کو بھی دور کرنا چاہتا ہوں جو معماران تاج کی گمنامی کے باعث پیدا ہوئی اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب معاصر تاریخوں میں تاج کے طراح کا نام تصریحاً نہیں لیا گیا ہے تو ہو نہ ہو "تاج کا طراح خود شاہ جہان" ہو گا۔

اس سے انکار نہیں کہ شاہ جہان خود بھی نقاد فن تھا۔ لیکن جب یہی معاصر تاریخیں اس طراحی کے معاملہ میں خاموش ہیں تو کیوں یہ خیال کیا جائے کہ شاہ جہان خود تاج کا طراح تھا۔ معاصر مورخوں نے جب شاہ جہان کے ایک ایک وصف کو چن چن کر گنایا ہے تو کیوں انہوں نے اس کے سب سے بڑے وصف کو نہیں لکھا۔ بلکہ اس کے عوض۔۔

"ہمعصر مورخین کا بیان ہے کہ ۱۰۴۱ھ مطابق ۱۶۳۱ء میں جب تعمیر روضہ کا انتظام شروع ہوا تو اس وقت ممتاز بیگم کا باپ باوجود ناسازیٔ صحت کے شاہ جہان کے ہمرکاب تھا اور بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ نے ماہرین فن سے مشورہ کیا اور مشورہ کے بعد ایک لکڑی کا نمونہ بنا کر پیش کیا گیا جو بعد میں منظور ہوا اور اسی نمونہ پر روضہ کی تعمیر ہوئی"۔

(معارف نمبر ۱۔ جلد ۲۰۔ مضمون از ڈاکٹر عبداللہ چغتائی)

ہمعصر مورخوں کی اس تحریر سے جن میں کسی انجینئر کا نام نہیں لیا گیا ہے، صاف ثابت ہے کہ شاہ جہان نے تاج کی طرح نہیں ڈالی۔ یہ ماہرین فن تھے جنہوں نے مشورہ دیا اور نمونہ پیش کیا تھا۔ اس لئے اب صرف دیکھنا یہ ہے کہ یہ ماہر فن اور نمونہ پیش کرنے والا او طرح ڈالنے والا کون تھا۔ مہندس کی مثنوی (جواب دریافت ہوئی ہے) ایک ناقابل تردید ثبوت پیش کرتی ہے کہ احمد معمار نے اس کی بنا ڈالی تھی۔

اس مثنوی کو صحیح تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں جبکہ اس کا ایک ایک لفظ اپنے اندر حقیقت لئے ہوئے ہے۔ اس میں مہندس نے پہلے اپنے باپ کے علم وفضل اور کمال فن کی تعریف کی ہے جس کی تصدیق دوسرے ہمعصر مورخین بھی کرتے ہیں۔ اس کے بعد قلعہ دہلی کی تعمیر کا دعویٰ ہے۔ اس کے متعلق بھی مورخین متفق ہیں کہ احمد نے اس کی طرح ڈالی تھی۔ پھر اپنے بھائیوں کے علم وفضل اور فن کی تعریف کرتا ہے اور یہ بھی محتاج ثبوت نہیں ہے۔ جب مہندس کی پیش کردہ تمام باتوں کا ثبوت دوسری کتابوں اور عمارتوں سے مل رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ تاج کے متعلق اس نے جو دعویٰ کیا ہے صحیح نہ ہو۔ اب رہا مورخین کا تصریحاً تاج کے ساتھ احمد کا نام نہ لکھنا تو اس کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ یعنی شاہ جہان کو ملکہ سے جو محبت تھی اور ملکہ کی وفات سے اس کو جو رنج پہنچا تھا، مورخوں نے اس کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:۔

"بادشاہ پر اس صدمۂ جانکاہ کا اس قدر اثر پڑا کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد فرطِ غم سے تمام بال سفید ہو گئے۔" ملا عبدالحمید لاہوری

"اس حادثہ کے بعد جب ذی قعدہ کا مہینہ آتا ہے تو بارگاہِ شاہ جہان میں تعزیت کا سامان ہوتا۔ بادشاہ سفید پوش اور تمام امرا ماتمی لباس میں ملبوس

ہوتے"۔ "عمل صالح"

یہی محبت اور غم کا نتیجہ تھا کہ اس نے ملکہ کی آخری آرام گاہ کے لئے تاج جیسا لاثانی روضہ بنانے کا ارادہ کیا اور اس امر پر بھی تمام مورخوں کو اتفاق ہے کہ اس عمارت سے شہنشاہ کو ایک عشق ہو گیا تھا اور اس نے ہر روز صبح و شام اپنے آپ کو اس کی تعمیر کے لئے وقف کر دیا۔ شہنشاہ کی اس محبت۔ اس سوز اور اس انہماک کو۔ کچھ کر مورخین نے یہی مناسب سمجھا ہے کہ تاج کے طراح کا نام چھوڑ دیا جائے تاکہ آئندہ تاج اور، محمد کا نام لازم و ملزوم نہ ہو جائے۔ ورنہ اگر شاہ جہان اس کی طرح ڈالتا تو وہ ضرور رکھتے ہوتے اور کوئی بات اس امر میں ان کے مانع نہیں تھی۔ لیکن مہندس کو چونکہ اپنے باپ کے کارنامہ کو ظاہر کرنا تھا۔ اس نے مصلحت سے کام نہیں لیا بلکہ حقیقتِ حال کو ظاہر کر دیا۔

دیوان مہندس

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آج میں تاریخ میں ایک انقلاب کی تخلیق کا موجب بن رہا ہوں۔ میں نے اوپر لکھا ہے کہ "تاج" کے متعلق میں نے متعدد انگریزی اور اردو میں دو کتابیں دیکھی ہیں[1] اور رسالہ پیمانہ آگرہ کا تاج نمبر اور دوسرے رسالوں میں تاج

---

[1] ۱۔ آگرہ گائیڈ المعروف بہ تاریخ عمارات شاہانِ مغلیہ مصنفہ منشی کالے خاں اکبرآبادی۔

۲۔ معین الآثار یا تاریخ تاج محل مصنفہ مولوی معین الدین احمد صاحب اکبرآبادی۔

کے متعلق متفرق مضامین نظر سے گذرے ہیں۔ لیکن میں نے اس وقت تک ان میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ جب تک کہ حضرت ڈاکٹر مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ نے "ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور" کے اجلاس میں اس موضوع پر ایک مقالہ نہیں پڑھا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ دنیا "دیوان مہندس" سے ناواقف ہے اور اس وجہ سے "تاج" کے اصلی معماروں کے ناموں اور ان کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ لہذا میں نے اس دیوان کو حضرت ممدوح کی خدمت میں بھیج دیا۔ پورے دو برس کی تحقیق و تفتیش کے بعد آپ نے رسالہ "معارف" کے چار نمبروں میں "تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ شائع کیا (جو اسی کتاب میں بجنسہ دیا گیا ہے) یہ گویا تاج کے معماروں کی ایک مستند تاریخ ہے۔

مہندس کا یہ قلمی فارسی دیوان چھوٹی تقطیع کے ۹۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔ مہندس عہدِ شاہ جہانی کا شاعر اور انجینئر ہے۔ دیوان میں چند قصائد۔ غزلیں۔ مثنویاں اور تاریخی قطعات ہیں۔ ان میں سب سے آخری تاریخ "داراشکوہ" کے محل کی ہے جو مہندس کی تعمیر ہے۔ اس کا سن ۱۰۴۶ھ ہے۔ کتاب کی تحریر کا سن ۴ جلوس عالمگیری ہے۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ نے اس سنہ پر "سنہ جلوس عالمگیری ہونے کا شبہ ظاہر کیا ہے۔ لیکن قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اوپر کی سطر کا لفظ "شد" کا دائرہ ۴ کے پہلے "کے" اس طرح آکر مل جانے سے مولانا نے اس کو ، قرار دیا ہے۔ کتاب پر سنہ خریداری بھی لکھا ہوا ہے اور یہ بھی قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب خود "مہندس" کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اس لئے کہ :-

(۱) نسخہ کے اخیر میں بجائے "نقل شد" کے "بوقت شب تحریر یافت" لکھا ہوا ہے

(۲) قصیدوں۔ مثنویوں اور قطعات کے عنوانات لکھے جانے سے رہ گئے ہیں۔ گو ان کے لئے جگہ چھوڑی گئی ہے۔

(۳) دو چار جگہ مصرعوں پر یا بعض الفاظ پر خط تنسیخ کھینچا ہوا ہے گو وہ مطلب و تقطیع کے لحاظ سے ٹھیک ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ان کی بجائے کچھ اور لکھنا چاہتا تھا۔ بلکہ ایک جگہ تو ایک مصرعہ کا صرف پہلا لفظ لکھا گیا ہے۔ بعد میں جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔

(۴) نسخہ کا سنہ تحریر ۴۲ سنہ جلوس عالمگیری ہے۔

اگر ۴۲ سنہ جلوس عالمگیری تسلیم کر لیا جائے تو مہندس کی وفات اس سے بیس سال پہلے ہو جاتی ہے جس سے نسخہ پر بجائے "تحریر یافت" کے "نقل شد" ضرور لکھا ہوتا اور آفتاب و سہا کے تناسب سے جو حروف و اعداد لکھے ہوئے ہیں نہ ہوتے۔ یہ حروف و اعداد اگر آفتاب و سہا کے تناسب سے نہیں ہیں تو پھر ۱۷ کے اعداد جو لکھے ہوئے ہیں تمام شبہات کو دور کر دیتے ہیں۔ ۱۷ سے مراد یقیناً ۱۰۷۱ سنہ ھ ہے جو عالمگیر کے جلوس کا چوتھا سال ہے۔

اب یہاں وہ تحریر دی جاتی ہے جو اس شبہ کا باعث ہوئی ہے:-

تمت تمام شد تا تحریر

۷ ای ۱۷ شہر ذی الحجہ ۴۲ سنہ

بوقت شب تحریر یافت

غرض اس قلمی نسخے نے "تاج" کی تعمیر کی ایک حقیقت مستورہ سے پردہ اٹھا دیا ہے اور اب اس میں کچھ بھی شک نہیں رہتا کہ "تاج" کی تعمیر کن معماروں نے کی۔ اب دعویٰ

کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ "تاج" کی تخلیق و تعمیر کا سہرا خاص ہندوستانیوں کے سر ہے میں نے اوپر کے جملے میں لفظ "تخلیق" کا استعمال عمداً کیا ہے۔ کیونکہ بغیر کسی نقشے یا نمونے کے کوئی عمارت نہیں بن سکتی۔ مہندس اپنی مثنوی میں بجائے "تعمیر" کے "بنا" کا لفظ استعمال کر کے اس شبہ کو دور کر دیتا ہے۔ لکھتا ہے :۔

کرد بحکم شہِ کشور کشا — روضۂ ممتاز محل را بنا
باز بحکم شہ انجم سپاہ — شاہ جہاں داورِ گیتی پناہ
قلعۂ دہلی کہ ندارد نظیر — کرد بنا احمد روشن ضمیر
ایں دو عمارت کہ بیاں کردہ ام — در صفتش خامہ رواں کردہ ام
یک ہنر از گنج ہنر ہائے اوست — یک گہر از کان گہر ہائے اوست

نہ صرف احمد معمار بلکہ اس کے تینوں با کمال بیٹے اور خصوصاً لطف اللہ مہندس اس فن میں یکتائے روزگار تھے۔ لکھتا ہے :۔

مہندسم کہ کنم صورت فلک تصویر — کشم بروے زمین گر خطوط پرکاری
چناں بلند نہادم شبیہ عمارت من — کہ نور مہر بود نزد نور او ناری

اوپر دی ہوئی ابیات میں پہلی بیت نقشہ نویسی کے متعلق ہے اور دوسری خود عمارت یا اس کے نمونے سے متعلق ہے۔

بہر طور اب یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ نہ صرف "تاج" بلکہ شاہ جہان کی دوسری عمارتوں کے انجینئر اور نقشہ نویس "احمد" اور اس کے بیٹے تھے اور اسی کمال فن کا نتیجہ ہے کہ تاج کے تیار ہونے کے بعد شاہ جہان نے احمد کو "نادر العصر" کا خطاب دیا اور لطف اللہ کو "مہندس" کا خطاب۔ مہندس لکھتا ہے :۔

از طرف داور گردوں جناب	"نادر عصر" آمدہ او را خطاب
گرچہ مرا ہست "مہندس" لقب	ہندسہ زاں ہر سہ برادر طلب

اس دوسری بیت سے معلوم ہوتا ہے کہ لطف اللہ اور اس کے دونوں بھائی فن ہندسہ (انجینرنگ) میں یکتائے روزگار تھے اور انہیں اس فن کے استاد ہونے کا دعویٰ تھا۔ نیز یہ بات بھی مہندس کے کلام سے ثبوت کو پہنچتی ہے کہ شاہ جہان کا چیف انجینئر احمد معمار تھا۔ ورنہ شاہ جہان کے دربار میں مہندس کو اس قدر جرأت نہ ہوتی کہ وہ اپنے باپ کے متعلق اس طرح لکھے :-

احمد معمار کہ در فن خویش	صد قدم از اہل ہنر بود بیش

اور اپنے باپ کے بعد جس کی وفات ۱۰۵۹ھ میں ہوئی تھی۔ وہ دارا شکوہ کے توسط سے شاہ جہان کے دربار میں اسی عہدہ کا طالب ہوتا ہے۔

لکھتا ہے :-

لطف شہ می کند مددگاری	ورنہ آگہ نیم ز معماری
خواندہ ام یک دو نسخہ از ہر باب	ہیئت و ہندسہ و نجوم و حساب
نہ نویسم ز بیم بے ادبی	ہر چہ خواندہ ام من از عربی
لطف شہزادۂ بلند اقبال	گر شود بندہ را معاون حال
خدمتے بندہ را بعہدہ ماند	کہ از و علم رفتہ باز آید
گر یکے از مقربان بساط	در دم عیش و در زمان نشاط
ایں سخن از مقیم ایں درگاہ	برساند بسمع حضرت شاہ
اجر یابد ز کردگار کریم	نہ کہ اجر قلیل۔ اجر عظیم

اس قدر لکھنے کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ احمد معمار اور اس کے تینوں بیٹوں کے نام کیوں مستور ہو گئے اور مہندس کا یہ دیوان بھی دنیا کی نظروں سے کیوں مخفی ہو گیا۔ مہندس کے دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "مہندس داراشکوہ سے وابستہ تھا۔ لکھتا ہے:۔

(۱) داراشکوہ۔ شاہجہان۔ بانیٔ جہاں — برشۂ مبارک ست سلیمانیٔ جہاں
پروردگار باد نگہبان دولت — زانرو کہ کار تست نگہبانیٔ جہاں
تا ز آب و آتش است نشاں در زمانہ باد — روشن زخاک پائے تو پیشانیٔ جہاں
اے بانیٔ جہاں کہ جہاں در ثنا ئے تست — یک لحظہ گوش دار ثنا خوانیٔ جہاں

تا کے مہندس است پریشاں چو زلفِ یار
اے از تو دور گشتہ پریشانیٔ جہاں

(۲) اے ز جود تو کامرانیٔ دہر — از وجودِ تو پاسبانیٔ دہر
بخدائے خدایگان زمان — بتو زیبا خدائیگانیٔ دہر
دہر را مدح تو وظیفہ بود — گوش کن بر وظیفہ خوانیٔ دہر
بتو زیبا ست خلعتِ شاہی — ز تو پیدا ست کامرانیٔ دہر

باشد از لطفِ تو مہندس شاد
اے ز لطفِ تو شادمانیٔ دہر

قصیدوں میں لکھتا ہے:۔

(۱) بدستیاریٔ لطف شہ بلند اقبال[1] — بلند پایہ زمن گشت قدر معماری

---

[1] "شہزادہ بلند اقبال" داراشکوہ کا خطاب تھا۔

سپہر مرتبہ دارا شکوہ دریا دل — کہ ہمچو ابر کفش می کند گہرباری

(۲) آں سلیمانؑ کے کہ گوید بے سخن — بحر و بر در زیر فرمان من ست
بزم او گوید کہ ماہ و آفتاب — پر تو شمع شبستان من ست
قصر او گوید کہ روز بار عام — قیصر و فغفور دربان من ست
جود او گوید کہ حاتم صبح و شام — ریزہ چین خوانِ احسان من ست
تیر او گوید کہ صنیغم بر فلک — چوں تنیں مجروح پیکانِ من ست
دستِ او گوید کہ ہنگام نشاط — فرقِ دشمن گوئے چوگانِ من ست

تاریخی دو دوسرے قطعات میں لکھتا ہے :-

(۱) دولتِ جاوید بخت سرمد و ملک دوام — ہم عنان و ہمدم شاہِ بلند اقبال باد
از کفِ دستش دُر و گوہر بر و دریا و کان — تا ابد دریا و کان زیر فیض مالامال باد
می کند احسان او درماندگاں را ماوریے — یا ور او ایزدِ ذوالمجدِ الافضال باد

(۲) ثناخوان ترا شاہا چہ حاجت مدح جم گفتن — بجام بادۂ حاجت نیست مست جام شہر را
چو می خواہی کہ باشد بانیٔ قصر ثنائے تو — بکار خشت و گل مگذار لطف اقد احمدرا

(۳) کدخدا گشت باقبال بلند — پور دارائے زمان شاہ زمیں
در زمانے کہ مرادات جہان — بود در روست چو در دست نگیں
گفت جبریل امین تاریخش — بہ سلیمان شدہ بلقیس قریں

(۴) چوں بنا کردہ قصرِ جاہ و جلال — ظلِ حق بادشاہ عالی ملک

لہ سلیمان - دارا شکوہ کے بیٹے کا نام تھا۔ لیکن یہاں مراد دارا شکوہ سے ہے ؛

شبیہ ایں عمارتِ والا — یافت چوں مہر برحوائی ملک
گفت معمار سال تاریخش — قصر دارا شکوہ والیٔ ملک

(۵) چوں تیار شد ایں کلید ظفر — بزبان دیں پرور وحق پژوہ
پئے سالِ تاریخِ انجامِ وے — خرد گفت مفتاحِ داراشکوہ

اور کہیں کہیں عالمگیر اورنگ زیب پر طعن وتعریض بھی ہے۔ داراشکوہ کو مخاطب کرتا ہوا لکھتا ہے:-

زہیبتش نہ تواں یافت نیم قطرۂ خوں — ہزار بار دلِ خصمش اربیفشاری
بزخمِ تیر کہ زد در دلِ معاندِ او — ربودہ رنگِ دلم را سپہرِ زنگاری
دراں دیار کہ بختِ حسودِ تست بخواب — ندیدہ دیدۂ مردم بخواب بیداری
مدام باد ہوا خواہ دولتِ تو بعیش — نصیبِ خصمِ تو جاوید باد خونخواری

(نوٹ:- غالباً آخری مصرعہ میں ان لڑائیوں کی طرف اشارہ ہے جو داراشکوہ اور عالمگیر میں تخت کے لئے ہورہی تھیں)

یہ امر تاریخ دانوں سے چھپا ہوا نہیں ہے کہ شاہ جہان کی زندگی ہی میں کس طرح اس کے بیٹوں میں تخت کے لئے خونریز لڑائیاں ہوئیں اور کس طرح عالمگیر اورنگ زیب کامیاب ہوا۔ شاہ جہان کو آگرہ میں نظربند کردیا گیا اور داراشکوہ کو قتل۔ ان واقعات سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ داراشکوہ کے حامیوں پر کیا گذری ہوگی اور کتنے لوگ جان کے خوف سے روپوش ہوگئے ہوں گے اور جو باقی رہے۔ ان کو عالمگیر کے ہاتھوں سے اگر کسی چیز نے بچائے رکھا تو وہ صرف شاہ جہان کا خاطر اور پاس نمک خواری تھا یا خود عالمگیر کو ان کے علم وکمال کا لحاظ تھا۔ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے اس دیوان

کا دنیا کی نظروں سے مخفی ہو جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں خصوصاً جب لطف اللہ مہندس اپنے علم وکمال اور مال ودولت کے لحاظ سے کافی رسوخ رکھتا تھا اور یہ مال ودولت اس کو داراشکوہ سے ملی تھی۔ جیسا وہ خود اپنے قصیدے میں لکھتا ہے :۔

این ہمہ دولت کہ می گویم مرا
از عنایت ہائے سلطان من ست

یہاں یہ کہا جائے گا کہ مہندس کے دیوان کے مخفی ہو جانے سے اس کے باپ کا نام تو گم نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن جو لوگ تاریخ پڑھ کر اس زمانے کے حالات کو جانچ سکتے ہیں۔ وہ آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مہندس کا چونکہ معتوب سلطانی تھا اس لئے کسی کو یہ جرأت نہ ہو سکتی تھی کہ اس خاندان کے کسی فرد کا نام لے یہ ممکن ہے کہ مہندس کی طرح احمد بھی اپنی زندگی میں داراشکوہ سے وابستہ رہا ہو۔

دیوان مہندس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر کی تخت نشینی کے بعد مہندس کی کوئی قدر ومنزلت باقی نہیں رہی تھی۔ بلکہ یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دشمنوں نے داراشکوہ کی طرفداری کے الزام میں اس کو بھی قتل کرا دینا چاہا اور یہ فتویٰ بھی لکھا جا چکا تھا۔ زمانہ کی اس نیرنگی اور اپنی بیچارگی سے مجبور ہو کر مہندس عالمگیر کی خدمت میں عرضی بھیجتا ہے۔ لکھتا ہے :۔

شہا۔ گرش برداد خواہے نداری | بحال گدایان نگاہے نداری
رقیبان بقتلم نوشتند فتوے | وگرنہ تو ہرگز گناہے نداری
جہاں سربسر خیر خواہے تو باشد | ولے ہمچو من خیر خواہے نداری
نیاری صبا سوئے بلبل پیامے | مگر سوئے گلزار راہے نداری

مہندس ازاں رو نداری وفائے　　کہ چوں زاہداں خانقاہے نداری

مہندس کا زندہ رہنا ہی اس کا ثبوت ہے کہ عالمگیر نے اس کی جان بخشی کردی تھی
لیکن اب اس کی زندگی بالکل بے کیف تھی۔ دولت۔ اثر اور رسوخ سب جا چکے تھے
باقی بیت کے دوسرے مصرع سے یہاں تک بھی معلوم ہوتا ہے کہ دربار تک بھی اس کو
رسائی نہیں تھی۔ زمانہ کی اس ناقدری سے اس کا حساس دل تڑپ اٹھتا ہے۔ مندرجہ بالا
غزل یا عرضی کے بعد ہی وہ ایک اور غزل لکھ کر جس میں زمانہ کے بے رحم سلوک کی شکایت
کی گئی ہے۔ وہ اپنا دیوان ختم کر دیتا ہے۔ یہاں غزل اور خاتمہ کے الفاظ دیئے جاتے ہیں

یوسف خبر از پدر نداری　　از دیو و پری خبر نداری
شاہا ز غرورِ حسن ہرگز　　بر حالِ گدا نظر نداری
ہر چند کہ زر افزوں غم افزوں　　مفلس تو خوشی کہ زر نداری
آنہم اثرے نداشت اکنوں　　اے نالہ تو ہم اثر نداری

خاکِ درِ دوست شو مہندس
زاں او کہ درے دگر نداری

تمت تمام شد تا تحریر
۱۷ ای ۱۷ شہر ذی الحجہ ۔۔۔سنہ
بوقت شب تحریر یافت

اوپر کی ابیات میں مہندس نے اس پر آشوب زمانہ کی حالت۔ اپنے حال پر عالمگیر
کی بے توجہی اور ناقدری کمال اور اپنی مفلسی و بے چارگی کا خاکہ کھینچا ہے اور دیوان کا
یکایک اس طرح اور اس حال میں ختم ہو جانا بھی بتلاتا ہے کہ واقعہ بہت دور کا نہیں بلکہ

جلوس عالمگیری کے بالکل قریب کا ہے۔ اس لحاظ سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ نسخہ کا سنہ تحریر ۴۱ سنہ جلوس عالمگیری ہے۔

اس کے بعد مہندس کا کوئی کارنامہ نظر نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ وہ گوشہ نشین ہو گیا ہو۔ البتہ مہندس کے بھائی کا نام رابعہ دورانی کے مقبرے کی تعمیر کے سلسلے میں ایک کتبے میں ملتا ہے۔ یہ مقبرہ عالمگیر کے حکم سے اورنگ آباد۔ دکن میں تعمیر ہوا تھا اور اب بھی باقی ہے۔ ممکن ہے کہ اس تعمیر کے سلسلے میں مہندس کا خاندان دکن میں آیا ہو اور اس طرح دیوان مہندس کے اس نسخے نے بھی نقل مکانی کیا ہو۔ کیونکہ ۱۱۵۵ھ / ۱۷۴۲ء میں (عالمگیر کی وفات سے ۳۵ سال بعد) یہ نسخہ تاریخ ہندوستان کی اس مشہور شخصیت کے کتب خانہ میں پہنچتا ہے۔ جس کا نام نواب ابراہیم خان بہادر ہزبر جنگ عرف گاردی ہے۔ نواب ابراہیم خان دکن کی ایک ممتاز ہستی ہے جو نظام الملک آصف جاہ کی ملازمت میں تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اس زمانہ کا ایک بہترین جنرل تھا۔ اس کا توپخانہ ہندوستان بھر میں مشہور تھا۔ ابراہیم خاں نے اپنی حربی تعلیم فرانسیسی جنرل بُسی Bussy کے ماتحت پائی تھی۔ اس نے نظام الملک کی ملازمت میں رہ کر مرہٹوں کو بڑی بڑی شکستیں دیں۔ لیکن آخر میں جب حیدرآباد سے اَن بن ہو گئی تو مرہٹوں کی ملازمت کر لی۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری جنگ میں اس نے مرہٹوں کا ساتھ دیا۔ مرہٹوں کو اس کے توپ خانہ اور سوار دستوں پر بہت ناز تھا۔ لیکن پانی پت کی جنگ میں جب مرہٹوں کو شکست ہوئی تو علاوہ اور جنرلوں کے ابراہیم خان بھی گرفتار ہو گیا اور اس کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد نہیں معلوم کہ اس کے کتب خانہ سے یہ کتاب کب اور کیسے نکلی۔

مجھے اسی قدر معلوم ہے کہ یہ نادر الوجود قلمی نسخہ میرے خاندان میں ایک نامعلوم زمانہ سے نہایت احتیاط و حفاظت کے ساتھ رکھا چلا آ رہا ہے۔ جہاں تک اپنے خاندان کا حال مجھے معلوم ہے وہ یہی ہے کہ میرے دادا عبداللہ خاں۔ جالنہ (دکن) کے ایک پٹھان خاندان سے تھے اور کسی بات پر اپنے والد فتح خاں سے ناراض ہو کر ویلور (صوبۂ مدراس) میں آ کر دوسری مدراس رجمنٹ میں ملازم ہو گئے۔ میرے والد صوبیدار صفدر خاں مرحوم بھی اسی رجمنٹ میں تھے۔ میری دادی جس خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ ٹیپو سلطان کی سلطنت خداداد کے زوال کے بعد سرنگا پٹم سے ویلور چلا آیا تھا۔ اس خاندان کو ٹیپو سلطان کی جانب سے ایک جاگیر بھی نواح ویلور میں ملی ہوئی تھی جس کی سندات بعد میں گم ہو گئیں۔ میرے نانا شیخ عبدالقادر مرحوم بھی اسی دوسری مدراسی رجمنٹ میں صوبیدار تھے۔ ان کا خاندان بھی سقوط سرنگا پٹم کے بعد سے ویلور میں مقیم رہا۔ بہر طور ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ "دیوان مهندس" کا یہ قلمی نسخہ یا تو جالنہ سے یہاں تک پہنچا۔ یا سرنگا پٹم سے۔

"کیا اس کتاب کو حفاظت سے رکھنے والوں کو یہ اندازہ ہو سکتا تھا کہ آیندہ زمانہ میں یہ چھوٹی سی کتاب دنیائے تاریخ میں ایک انقلاب عظیم کا باعث بنیگی اور "تاج" کے معماروں پر جو پردہ پڑا ہوا ہے تین سو سال بعد اس کے ذریعہ اٹھ جائیگا۔"

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ میں نے دیوان مهندس کا یہ قلمی نسخہ حضرت ڈاکٹر مولوی سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ العالی (ایڈیٹر معارف اعظم گڈھ) کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ پورے دو برس کی تحقیق و تفتیش کے بعد علامۂ ممدوح نے ادارۂ معارف اسلامیہ۔ لاہور میں پڑھے ہوئے مقالہ پر نظر ثانی کرتے ہوئے اس نسخہ کی روشنی میں ایک دوسرا مقالہ لکھا

جو رسالۂ معارف کے چار نمبروں میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد مولانا نے ممدوح نے کتاب واپس کرتے ہوئے لکھا کہ اس نادرۂ روزگار نسخہ کی بہ کمال حفاظت کی جائے کیونکہ دنیا میں مہندس کے کلام کا یہی ایک نسخہ باقی ہے حضرت ممدوح کی اس رائے کو عمل میں لانے کے لئے میرے خیال میں سب سے بہتر تجویز یہی آئی کہ دیوان مہندس کو بجلنسہ چھاپ دیا جائے۔

دیوان مہندس کے ساتھ حضرت ممدوح کا وہ مقالہ بھی ضروری تھا جس میں آپ نے احمد معمار کے پورے خاندان پر ایک بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے۔ یہ گویا معماران تاج کی ایک مفصل تاریخ ہے۔ میں ممنون ہوں کہ میری درخواست پر آپنے اس مقالے کو اس کتاب میں شامل کرنے کی اجازت عطا فرمادی۔

کتاب کے اخیر میں سیر تاج کے عنوان سے ایک مضمون ہے۔ یہ مضمون رسالۂ پیمانہ آگرہ کے تاج محل نمبر نومبر ۱۹۳۰ء سے لیا گیا ہے۔ تاج کے بیان میں یہ مضمون حضرت سیاب اکبر آبادی ظلہ نے "تاج صفحۂ تاریخ پر" کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس کتاب میں مضمون کا صرف وہ حصہ لیا گیا ہے جو سیر تاج کے ذیلی عنوان سے شروع ہوا ہے میں حضرت سیاب کا شکر گذار ہوں کہ آپنے اس مضمون کو اس کتاب میں شائع کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ یہ مضمون تاج دیکھنے والوں کے لئے گویا ایک گائڈ یا رہنما ہے اور جنہیں تاج دیکھنے کا اتفاق نہ ہو۔ وہ اس سے اس کی خوبصورتی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ضرورت تھی کہ معماران تاج اور تاج کے بیان کے بعد آسودگان تاج کی زندگی کے حالات بھی دے دیئے جائیں۔ اس خیال سے میں نے حضرت صاحبقران ثانی شاہ جہان اور ملکہ ارجمند بانو بیگم (ممتاز محل) کی مختصر سوانح لکھ کر کتاب کے اخیر میں شامل کر دیئے۔

کتاب نہ صرف صناعان تاج بلکہ ان تمام ہنروروں اور صناعوں کی خدمت میں خراج عقیدت ہے جنہوں نے قطب الدین ایبک کے زمانہ سے لیکر زوال سلطنت مغلیہ تک ہمارے تمدن کو شاندار بنانے کے لئے محنت کی تھی۔ اسی خیال سے میں نے ایک فہرست بھی دی ہے جس میں ہندوستان کے اسلامی دور کی تمام قابل ذکر عمارات کے نام آگئے ہیں۔ اس فہرست میں صرف چند صناعوں کے نام ملتے ہیں۔ باقی تمام گمنام ہیں۔ یہ ہماری تاریخ کی تہی دستی کا نتیجہ اور ہماری تمدنی بدبختی کا نمونہ ہے۔ ورنہ قطب مینار سے لے کر اسلامی دور کی آخری عمارت تک اگر غور کیا جائے تو صدہا ہنرور اور صناع ہوں گے جو ہمارے تمدن کو دنیا میں یادگار بنانے کی سعی کر رہے تھے جس طرح ان ہنروروں اور صناعوں نے دنیا میں ہماری یادگاریں قائم کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح میں نے آج ان کی یادگار قائم کرنے کی اس کتاب کے ذریعہ کوشش کی ہے۔ دعا ہے کہ خدائے پاک میری اس کوشش کو بھی اسی طرح مقبول بنائے۔ جیسے ان ہنروروں اور صناعوں کی تعمیرات ہیں۔ آمین

بنگلور۔ مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۶ء

محمود
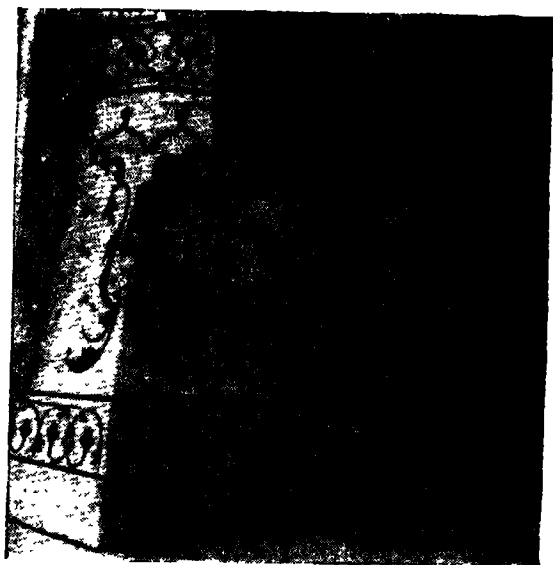
ستون بر نقش و نگار

اسلامی تعمیرات

مسلمانوں کے اس ملک میں آنے سے پہلے ہندوستان ایک خاص تہذیب و تمدن
ب تھا اور اس تمدن کے ذیل میں ایک خاص طرزِ تعمیر بھی پایا جاتا ہے جو ابھی تک
دں کی صورت میں ہمارے سامنے جلوہ آرا ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شمالی ہند
تعمیر جنوبی ہند سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ شمال میں آریائی حملوں کے بعد آریائی
ن اور تہذیب قدیم تمدن پر غالب آگئی تھی۔ لیکن جنوب اس کے اثر سے بالکل محفوظ
ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ "تمام ہندوستان میں ہندو مذہب اور ہندو تمدن و تہذیب
پنے اصلی و حقیقی رنگ میں نظر آتے ہیں تو وہ جنوبی ہند ہے۔ جہاں کی زبانیں ٹمیل، تلگو
ی اور ملیالم سنسکرت زبان سے بھی قدیم تر ہیں۔ اس لئے یہاں کا ہندو اپنے آپ کو
یت مجموعی ڈریویڈین اور اپنے ملک کو ڈراویڈا یا لسانی تقسیم کے لحاظ سے یا

ٹامل ناڈو (Tamil Nad) آندھرا (Andhra) کنارا (Canara)
یا کرناٹک (Carnatic) اور کرالا یا ملیبار (Malabar)
کہنے پر فخر محسوس کرتا ہے۔

آریائی قوموں کے بعد جب مسلمان فاتحین ہندوستان میں آئے تو اس وقت شمال میں ایک ایسا تمدن مروج تھا جس میں آریائی عنصر غالب تھا اور جنوب میں بھی تمدن اپنے قدیم طرز پر موجود۔ اس لئے تعمیرات بھی دو مختلف طرز کی موجود تھیں۔ بہر طور مسلمانوں کی آمد کے وقت ملک بہ حیثیت مجموعی ایک ایسے تمدن کا مالک تھا جس کی شان و شوکت قوی ہیکل اور فلک بوس محلوں اور مندروں اور ان کی دولت و حشمت سے ظاہر ہوتی تھی چنانچہ محمود غزنوی اس تمدن کی نسبت اپنے ایک سپہ سالار کو لکھتا ہے :۔

" اس حیرت انگیز شہر (متھرا) میں ایک ہزار سے زیادہ عمارتیں ہیں زیادہ تر سنگ مرمر کی اور ایسی مضبوط جیسا کہ مسلمانوں کا دین اور پھر کفار کے مندر اس کے سوا ہیں۔ اگر حساب کیا جائے کہ ان عمارتوں میں کتنا روپیہ خرچ ہوا ہے۔ تو غالباً اس کی مقدار کئی کروڑ دینار کی ہو گی اور پھر بھی اس کثرت سے عمارتیں دو سو برس کے اندر نہیں تیار ہو سکتیں۔ ان کفار کے مندروں میں میری فوج نے پانچ بت سونے کے پائے جن کی آنکھیں یاقوت کی تھیں اور صرف ان آنکھوں کی قیمت پچاس ہزار دینار تھی۔ ایک اور بت کے گلے میں ایک نیلم تھا۔ جس کا وزن چار سو مثقال تھا اور خود یہ بت گلایا گیا تو اس میں ۹۸ مثقال سونا نکلا۔ دوسری جگہ ہم کو چند بت چاندی کے ملے جن میں سے ہر ایک ایک اونٹ کا بوجھ تھا۔ (تمدن عرب صفحہ ۱۶۲)

ان حالات میں ترکوں نے جو عربوں کی ہی ایک مفتوحہ قوم تھی۔ اس ملک پر حملہ کیا۔ یہ حملے محمود غزنوی اور محمد غوری نے کئے جو ترکی النسل تھے اور یہ شہاب الدین محمد غوری ہی ہے جس نے اس ملک میں اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ لیکن اس کی اچانک وفات (شہادت) سے اس کا ترکی النسل غلام اور سپہ سالار قطب الدین ایبک ہندوستان کا پہلا شہنشاہ ہوا۔ اب مسلمان چونکہ اس ملک میں مستقل رہائش اختیار کر چکے تھے۔ اس لئے انہیں اپنے لئے رہائش گاہوں اور عبادت خانوں کی ضرورت ہوئی۔ اس وقت مسلمان علاوہ ایک مذہب کے ایک خاص تمدن اپنے ساتھ لائے تھے جس کا طرزِ تعمیر ہندوؤں کے مذہب۔ تمدن اور طرزِ تعمیر سے بالکل علیحدہ تھا۔ مسلمانوں کا مذہب اسلام تھا۔ ان کا تمدن عربی اور ان کی طرزِ تعمیر عربی طرزِ تعمیر تھی۔

عربوں میں اسلام لانے سے پہلے کوئی قابل ذکر تمدن موجود نہیں تھا اور ان کی تعمیرات بھی بالکل سادہ ہوتی تھیں۔ عرب کے بادیہ نشینوں کی ضروریاتِ زندگی بالکل مختصر اور ان کی رہائش یا تو مٹی کے بنے ہوئے معمولی گھروں میں تھی یا معمولی خیموں میں۔ ان کے ملک کے قدرتی ذرائع بھی ایسے نہ تھے جو تعمیرات کو پُرشوکت بنانے میں مدد دیتے۔ لیکن انہی عربوں نے اسلام لانے کے بعد جب ایران فتح کیا تو انہوں نے ایرانی طرزِ تعمیر کو اختیار کرتے ہوئے اپنی جودتِ طبع اور ذہانت سے اس ایرانی طرز میں کچھ ایسی جدتیں پیدا کر دیں کہ ایک بالکل نیا اور خوبصورت طرزِ تعمیر پیدا ہو گیا جس کو "عربی طرزِ تعمیر" کہا جاتا ہے جس کے نمونے آج بھی مسجد سیدنا عمرؓ (فلسطین) جامع دمشق (شام) قصر الحمرا۔ جامع قرطبہ (اندلس) اور مصر کی مسجدوں میں پائے جاتے ہیں۔ عربوں نے ملک سندھ پر بھی حملہ کیا تھا۔ لیکن ان کی اقامت اس ملک میں اس قدر مختصر تھی کہ یہاں وہ اپنی کوئی مادی

یادگار نہ چھوڑ سکے۔ لیکن تین سو سال بعد جب ترکوں نے اس ملک پر حملہ کیا تو وہ اپنے ساتھ اپنے فاتحین کا طرزِ تعمیر لے آئے۔ لیکن چند سالوں کے بعد ہی جب ان کی اقامت اس ملک میں مستقل ہوگئی تو اس طرزِ تعمیر میں ہندوستان کا طرزِ تعمیر بھی شامل ہوگیا یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول سے ایک ملے جلے تمدن اور ایک مشترکہ زبان کی بنیاد پڑی جس کو آج ہندوستانی یا اردو کہا جاتا ہے۔

یہ اگلے مسلمان جن میں ترک بھی ہیں۔ سید بھی ہیں اور پٹھان بھی پانچسو سال تک ہندوستان پر حکومت کرتے رہے۔ دہلی تو پایہ تخت تھا۔ یہاں نئے نئے شہر بسائے گئے مسجدیں محلات اور مقبرے تعمیر ہوئے جن میں کچھ باقی ہیں اور کچھ امتدادِ زمانہ کی نذر ہوگئے اور جن کے نشان اب بھی دہلی کے کھنڈروں میں ملتے ہیں۔ یہ عمارتیں خشت و گل کی تھیں۔ اس لئے اس عہد کو ماہرینِ فنِ تعمیر نے خشت و گل کا عہد کہا ہے۔

قطب الدین ایبک کے پانچ سو سال بعد مغلوں نے اس ملک کو فتح کر لیا۔ گو بابر کو بھی باغوں اور عمارتوں کا شوق تھا۔ لیکن اس کے چار سالہ مختصر عہد میں کوئی قابل دید عمارت بن نہ سکی۔ اس کے فرزند ہمایوں کا دور بھی عمارات سے خالی نظر آتا ہے۔ البتہ بابر و ہمایوں کے عہد میں اگر کچھ عمارتیں تعمیر ہوئیں تو وہ بھی خشت و گل ہی کی تھیں ان میں کوئی جدت نہیں پائی جاتی۔ ہمایوں کے بعد جب شیر شاہ افغان تخت نشین ہوا تو اس نے جہاں ملکی و مالی انتظام میں ایک نئی روح پھونکی۔ وہاں اس کی عمارتیں بھی جدید طرز کی نظر آتی ہیں۔ ماہرینِ فن کا خیال ہے کہ یہ خالص افغانی طرز کی ہیں۔ اس افغان خاندان کے مختصر عہد کے بعد پھر حکومت مغلیہ خاندان میں آجاتی ہے۔ اکبر تخت نشین ہوتا ہے۔ تعمیرات سے اس کو ایک خاص شوق تھا۔ اس کی جدت پسند طبیعت نے

خشت و گل کو چھوڑ کر سنگِ سرخ اختیار کیا۔ اس نے آگرہ اور فتح پور سیکری میں جس قدر عمارتیں بھی بنائیں۔ ان تمام میں سنگ سرخ ہی لگا ہوا ہے۔ اس لئے مورخین اس کے عہد کو "سنگ سرخ کا عہد" کہتے ہیں۔ گو اکبر کے عہد کی عمارتیں بھی قابل دید ہیں۔ لیکن جب اس کا پوتا شاہ جہان تخت نشین ہوتا ہے تو اس کی طبع نفیس نے سنگ سرخ پر سنگ مرمر کا حاشیہ چڑھایا۔ چنانچہ اس عمارت گر شہنشاہ کے عہد میں جس قدر تعمیرات بھی ہوئیں۔ یہ تمام کی تمام سنگ مرمر سے بنا ہوئیں۔ سنگ مرمر کا یہ عہد اسلامی تعمیرات کی تاریخ کا ایک ایسا درخشا کارنامہ ہے کہ ماہرینِ فن تعمیر کی رائے ہے کہ اگر شاہ جہان جلیسا شہنشاہ ہندوستان کو نصیب نہ ہوتا تو مغلوں کی بنائی ہوئی دوسری عمارتیں کچھ قدر و قیمت نہ رکھتیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خاندانِ مغلیہ کے اس دور نے اپنی جدت پسندیوں سے تمدن میں ایک خاص شان اور تعمیرات میں ایک خاص ندرت پیدا کردی جس کی وجہ سے ماہرین نے اس تمدن کو خالص "مغلیہ تمدن" اور طرزِ تعمیرات کو "مغلیہ طرزِ تعمیر" کا نام دیا ہے جس کی بہترین مثالیں لال قلعہ دہلی۔ موتی مسجد اور تاج محل آگرہ ہیں۔

مغلوں کا فنِ تعمیر شاید "تاج" کی وجہ سے اپنے انتہائی عروج کو پہنچ چکا تھا۔ قدرت کا یہ اٹل قانون کہ "ہر عروج کے بعد زوال ہے" اس اصول نے اپنا کام کرنا شروع کردیا گو مغلیہ سلطنت اس کے ایک عرصہ بعد تک بھی قائم رہی۔ لیکن اس عرصہ میں جو بھی تعمیرات ہوئیں بجائے عروج کے زوالِ فن کا نمونہ پیش کررہی ہیں۔

تاریخی لحاظ سے تعمیرات کے تین دور یعنی (۱) خشت و گل (۲) سنگ سرخ (۳) سنگ مرمر کی تشریح اوپر کی جاچکی ہے۔ اب صرف یہ دکھانا ہے کہ ان تعمیرات کی مخصوص طرز کیا ہے الفاظ سے اس کی تشریح ناممکن ہے۔ جب تک کہ ایک ماہر فن تعمیر مختلف عمارتوں کے نقشے

پیش کر کے یا عمارتوں کو ہی بتلا کر ان کی جزئیات جیسے میناروں۔ کمانوں۔ محرابوں۔ طاقوں اور گنبدوں کے فرق کو ظاہر نہ کرے۔ صرف تحریر سے کسی طرز کا سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ اس لئے اس کو سر دست نظر انداز کرتے ہوئے یہاں صرف یہ دکھایا جاتا ہے کہ ان تعمیرات میں جو طرزیں اختیار کی گئی ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:-

۱۔ خالص عربی طرز	قطب مینار و مسجد قوۃ الاسلام دہلی
۲۔ عربی و ہندی طرز	عام طور پر تمام مسجدوں میں پائی جاتی ہے
۳۔ ترکی و ہندی طرز	علائی دروازہ نزد قطب مینار دہلی
۴۔ ایرانی و ہندی طرز	مقبرۂ ہمایوں دہلی
۵۔ افغانی و ہندی طرز	مقبرۂ شیر شاہ افغان۔ سہسرام
۶۔ عربی و جنوب کی ہندی طرز	بیجاپور کی عمارتیں
۷۔ عربی۔ ایرانی و ہندی طرز (مغلیہ نمونہ)	تاج محل آگرہ

(نوٹ:- ترکی و افغانی طرز۔ یہ دونوں طرزیں عربی طرز کی ہی خوشہ چین ہیں)

ہندوستان کی اسلامی عمارتوں میں ان طرزوں کے ہوتے ہوئے بھی ہر جگہ کی طرز تعمیر میں ایک اور فرق نظر آتا ہے۔ یہ فرق اس مذاق کی وجہ سے ہے جو صوبوں یا اضلاع کے مقامی صناع اور معماروں کا تھا۔

فہرست

(نوٹ:- اس فہرست میں عمارتوں کے نام عہد بہ عہد دیئے گئے ہیں اور صرف ان عمارات کے نام دیئے گئے ہیں جنہیں ماہرین فن تعمیر نے صنعتی لحاظ سے

قابل ذکر یا قابل دید قرار دیا ہے)

خاندانِ غلاماں (۱۲۰۶ء - ۱۲۹۰ء)

۱۔ قطب الدین ایبک (۱۲۰۶ء - ۱۲۱۰ء) قطب مینار دہلی، مسجد قوۃ الاسلام دہلی، مسجد اڑھائی دن کا جھونپڑا (اجمیر)

قطب مینار دنیا کا ایک عظیم ترین مینار ہے جو مسجد قوۃ الاسلام کے لئے تعمیر کیا گیا قطب الدین ایبک کا ارادہ تھا کہ پایہ تخت میں ایک ایسی مسجد تعمیر کی جائے جو دنیا کی تمام مسجدوں سے بڑی ہو۔ قطب مینار تو بن گیا۔ کیونکہ قطب الدین ایبک کے بعد اس کے جانشینوں نے بھی اس کی تعمیر کی۔ لیکن مسجد قوۃ الاسلام کی تعمیر تو ہوتی رہی لیکن یہ کام اس قدر بڑا تھا کہ مکمل نہ ہو سکا۔ قطب مینار کی اونچائی ۲۴۲ قدم ہے اس قدر عالی شان مینارہ اور مسجد تعمیر کرنے سے قطب الدین ایبک کی مراد ہندوستان میں مسلمانوں کے فتوحات کی دھاک قائم کرنا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے ہندوستان کے عالی شان مندر اور محلات موجود تھے۔ یہ ایک فطرتی جذبہ تھا جو اس کو مجبور کر رہا تھا کہ اپنی تعمیرات کو مفتوحین کی تعمیرات پر فوقیت دے۔ زمانۂ قدیم سے ایک ضرب المثل چلی آتی ہے کہ "دلی جس کے ہاتھ میں ہے۔ ہندوستان اسی کا ہے"۔ لہٰذا اس شہر کو جس کو شاید قدرت نے ہی پائے تخت بننے کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ ایک ایسی ہی عمارت کی ضرورت تھی کہ دوسرے ملکوں پر اپنی صولت وعظمت کا سکہ بٹھا سکے اور یہ تعجب سے دیکھا جائیگا کہ جس زمانہ میں قطب الدین ادھر ہندوستان میں قطب مینار تعمیر کر رہا تھا تو ادھر اندلس میں اس کے ہم عصر یوسف اول نے شہر اشبیلیہ (سیویل - اندلس) میں قطب سے بھی بڑا مینار

تعمیر کرنا شروع کرایا تھا جس کو جبرالدا کہا جاتا ہے۔ اسلام اگر اس زمانہ میں ہندوستان تک پہنچ گیا تھا تو اُدھر مغرب میں اندلس تک۔ اور یہ دو مینار گویا حدود سلطنت اسلام کی نشانیاں تھیں۔ چند لوگوں کی رائے ہے کہ قطب مینار میں ہندو فن تعمیر کو بہت بڑا دخل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس لاٹھ کو ہندوؤں نے بنایا تھا اور مسلمانوں نے اسی جگہ مسجد قوۃ الاسلام کی بنیاد ڈال کر اس کو مینارہ کی شکل دینے کے لئے کچھ ترمیمیں کیں اور کتبے لگا دیئے۔ سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں لکھا ہے:-

"جو بات کہ مدت سے مشہور چلی آتی ہے کہ یہ لاٹھ رائے پتھورا نے اپنے قلعہ اور بت خانے کے ساتھ سنہ بکرا جیت مطابق ۱۱۴۳ء موافق ۵۳۸ھ کے بنائی صحیح معلوم ہوتی ہے"

(آثار الصنادید ــــ صفحہ ۱۷)

لیکن ماہرین فن کا کہنا ہے کہ یہ لاٹھ شروع سے آخر تک مسلمانوں کی بنائی ہوئی ہے پرسی براؤن (PERCY BROWNE) جو ایک مستند ماہر فن ہے لکھتا ہے:-

"یہ پوری تعمیر مسلمانوں کی ہے اور خالص عربی طرز کی ہے۔ اس میں جو پتھر لگے ہوئے ہیں وہ ہندوؤں کے ان مندروں اور عمارات سے لئے گئے جن کو مسلمانوں نے ڈھادیا تھا۔ انہیں پتھروں کو دیکھ کر یہ غلط فہمی ہو رہی ہے کہ یہ لاٹھ ہندوؤں کے زمانے کی ہے۔ یہ تو مسلم ہے کہ رائے پتھورا کا مندر اسی جگہ تھا۔ اور رائے پتھورا نے ایک لاٹھ بھی تعمیر کی تھی۔ اگر رائے پتھورا کی کچھ نشانی باقی ہے تو صرف یہی کہ اس لاٹھ کا بنیادی چبوترا اب بھی وہی ہے جو رائے پتھورا کے لاٹھ کا تھا"

مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاؤلی بان لکھتا ہے:-

"قطب صاحب کی لاٹ۔ عربوں کی سب سے قدیم عمارتیں ہندوستان میں وہ ہیں جو بارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں تعمیر ہوئیں۔ ایک تو قطب صاحب کی مسجد جو دہلی کے قریب ۱۱۹۰ء میں بنی تھی اور دوسری قطب صاحب کی لاٹ۔ قطب صاحب کی لاٹ ایک ڈوریا دار مینار ہے اور اس کی صورت ایک لمبے مخروط کی ہے جس کا اوپر کا حصہ کٹا ہوا ہے۔ اس مخروط پر جا بجا عربی نقش ونگار کے حلقے بنے ہوئے ہیں اور نیچے سے اوپر تک کئی تیغہ کے ترشے ہوئے کٹہرے نصب کیے ہوئے ہیں یہ لاٹ جس کے صرف کٹہرے اور طرز آرائش عربی ہے قطب الدین کے وقت میں بنی تھی یا یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے وقت میں ختم ہوئی تھی۔ اور اسی وجہ سے بطور اختصار اسے قطب کہتے ہیں۔ اور اسی نام سے وہ یورپ میں مشہور ہے۔"

(تمدن عرب ۱۸۵)

۲۔ شہاب الدین التمش (۱۲۱۱ء۔ ۱۲۳۶ء)

(۱) مسجد اڑھائی دن کا جھونپڑا (اجمیر) کی توسیع

(۲) مسجد قوۃ الاسلام دہلی کی توسیع

(۳) ناصر الدین محمود کا مقبرہ (دہلی) ۱۲۳۱ء (ناصر الدین محمود التمش کا فرزند تھا)

(۴) مقبرہ التمش دہلی۔

اسی شہنشاہ کے زمانے میں پایہ تخت سے چھوٹے نمونے بدایوں میں (جو دہلی سے ۱۵۰ میل دور ہے) یہ تعمیرات ہوئیں:۔

(۵) حوض شمسی

(۶) شمسی عیدگاہ

(۷) جامع مسجد۔ اس مسجد میں مختلف عہدوں کی طرزِ تعمیر کے نمونے پائے جاتے ہیں کیونکہ تعمیر کے ایک سو سال بعد سلطان محمد تغلق نے اس کو از سرِ نو تعمیر کیا اور پھر جب یہ مسجد گر گئی تو اکبر نے ۱۵۵۵ء میں اس کی تعمیر کی۔

اسی زمانہ کی ایک اور مسجد ناگوڈ (ریاست جودھپور) میں پائی جاتی ہے۔ اس کی طرزِ تعمیر سے پایا جاتا ہے کہ یہ انہیں صناعوں کے فن کا نتیجہ ہے جنہوں نے اجمیر میں اڑھائی دن کا جھونپڑا تعمیر کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عمارت کے گر جانے پر محمد بن تغلق نے پھر اس کو تعمیر کیا تھا۔

بیانہ میں بھی ایک اسی طرز کی مسجد تھی جو بعد میں مندر بنا لی گئی۔

التمش کے مقبرہ کی تعمیر کے ساتھ ہی خاندانِ غلاماں کی تعمیرات کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ساٹھ سال تک کوئی قابلِ ذکر عمارت نہیں ہوئی۔ البتہ اس عرصہ کے بعد بلبن کا مقبرہ تعمیر ہوتا ہے جو خاندانِ غلاماں کی پچھلی طرزِ تعمیر سے بالکل مختلف ہے۔ بلبن کے زمانہ کی ایک مسجد دہلی میں نظام الدین اولیا کے احاطہ میں پائی جاتی ہے جس کو جماعت خانہ مسجد کہتے ہیں۔

خاندانِ خلجی

علاؤ الدین خلجی

(۱) علائی دروازہ۔ دہلی۔

(۲) چتوڑ کا محل

خاندانِ غلاماں کے بعد جب خاندانِ خلجی سر پر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے

ایک نئی دہلی کی بنیاد ڈالی جس کو "سری" کہا جاتا ہے جو ہندوؤں میں پاک کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے اور یہ لفظ ایک دہلوی مصنف کے قول کے مطابق امیر خسرو کا تجویز کردہ تھا جو سلطان کی ملازمت میں تھے اور انہوں نے ہندو مسلم ارتباط کے خیال سے یہ نام ہندوستان کے نئے پایۂ تخت کا رکھا تھا۔

علاؤالدین خلجی۔ نے قطب ہی کے نزدیک ایک عالی شان مسجد تعمیر کرنی چاہی۔ یہاں کچھ کام بھی ہوا۔ لیکن اب سوائے علائی دروازہ کے یہاں اور کچھ باقی نہیں ہے۔ اس دروازہ کی تعمیر میں عربی طرز کے ساتھ سلجوقی طرز بھی نمایاں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اسی زمانہ میں مغلوں نے سمرقند میں سلجوقی حکومت کا خاتمہ کر دیا تو وہاں کے صناع اور معمار ہندوستان چلے آئے تھے۔ تمدن عرب کا مصنف لکھتا ہے:۔

"علاالدین کا دروازہ۔ اسی حصار کے اندر جس میں قطب کی لاٹ اور مسجد ہے اور بھی چند یادگاریں واقع ہوئی ہیں۔ جن میں سے ایک تھوڑا کا مندر ہے۔ لیکن سب سے زیادہ مشہور وہ یادگاری دروازہ ہے جسے علاالدین نے ۱۳۱۰ء میں تعمیر کیا تھا۔ یہ نہ فقط نہایت ہی حسین عمارت ہے بلکہ مسلمانوں کی فن تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ آج عربوں کی یادگاروں میں اس عمارت سے عمدہ کوئی عمارت نہیں ہے اور باستثنا چند دروازوں کے جو قصر الحمرا کے اندر واقع ہوئے ہیں۔ میں نے کوئی چیز اس کے مقابلہ کی نہیں دیکھی۔ تناسب اجزا کے لحاظ سے اگر یہ دروازہ علاالدین کی یادگار کار استہ نہ واقع ہوتا تو اسے کہہ سکتے تھے کہ یہ کسی عظیم الشان کلیسا کا در وکا در ہے . . . . دروازہ کے ستون ہندی وضع کے ہیں اور محرابوں کا طرز اور بہت بڑا حصہ آرائشوں کا عربی ہے اور عمارت

کی مجموعی صورت کسی قدر اُن دروازوں کی یاد دلاتی ہے جو ایران کی اسی قسم کی عمارتوں میں ہوا کرتے ہیں۔ علاءالدین کا دروازہ جس قدر عظیم الشان ہے۔ اتنا ہی مستحکم بھی بنا ہوا ہے۔ اندلس کی اینٹوں کی جگہ پر یہاں پتھر سے کام لیا گیا ہے اور پتھر کے تراشے ہوئے گل بوٹے قصر الحمرا کے سادہ مصالح کا کام دیتے ہیں۔"

(تمدّن عرب صفحہ ۱۸۶)

یہی مصنّف آگے چل کر لکھتا ہے :-

"تمدّن عرب کا اثر ہندوستان میں اس قدر پھیلا کہ ہندوؤں نے بھی اُن کی طرز کو اپنی قدیم عمارتوں کے لئے اختیار کیا۔ اس کی ایک عمدہ مثال بندرابن کے مندر کا ایک حصّہ ہے۔"

(تمدّن عرب صفحہ ۱۸۷)

خاندان خلجی میں علاءالدین کے بعد مبارک شاہ خلجی نے اوکھا میں ایک مسجد تعمیر کی۔

خاندان تغلق (۱۲۹۰ء - ۱۳۲۰ء)

غیاث الدین تغلق (۱۳۲۱ء - ۱۳۲۵ء)

(۱) نئی دہلی (تغلق آباد)

(۲) تغلق کا مقبرہ۔ دہلی

(۳) شاہ رکن عالمؒ کا مقبرہ۔ ملتان

علاءالدین خلجی کی طرح غیاث الدین تغلق نے بھی ایک نئی دلّی بسائی جس کو تغلق آباد کہا جاتا ہے۔ یہ اجاڑ ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی پھٹکار ہے۔ کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ "تغلق آباد یا رہے اوجڑ یا رہے گوجر" چنانچہ اب تک

یہ قلعہ آدھا اجاڑ ہے اور آدھے میں گوجر قوم بستی ہے۔

غیاث الدین تغلق کے عہد کی تعمیرات کا بہترین نمونہ خود اس کا مقبرہ ہے۔

محمد بن تغلق (۱۳۵۱ء - ۱۳۲۵ء)

جہاں پناہ (دہلی)

اس شہنشاہ نے بھی ایک نئی دہلی آباد کی جس کو "جہاں پناہ" کا نام دیا گیا۔ اب اس ویرانہ میں ست پلا، بجے یا دیجے منڈل اور کسی امیر کے محل کا کچھ حصہ پایا جاتا ہے۔ جس کو بارہ کھمبا کہتے ہیں۔ محمد بن تغلق کی بہترین یادگاریں اس کی ملکی فتوحات اور ملکی و مالی انتظامات ہیں۔

فیروز تغلق (۱۳۸۸ء - ۱۳۵۱ء)

(۱) کالی مسجد دہلی سنہ ۱۳۷۰ء

(۲) بیگم پوری مسجد دہلی سنہ ۱۳۷۰ء

(۳) تیمور پوری میں درگاہ شاہ عالم رح میں مسجد۔

(۴) کھڑکی مسجد (جہاں پناہ۔ دہلی میں)

(۵) کلاں مسجد (شاہ جہاں آباد دہلی میں) اسے عرفِ عام میں کالی مسجد بھی کہتے ہیں

(۶) فیروز تغلق کا مقبرہ۔ دہلی

(۷) مقبرۂ خان جہان تلنگانی۔ دہلی۔

تغلقوں کے اخیر عہد کی تعمیر کا نمونہ "ریاست اورچھا" کی جامع مسجد ہے جو جھانسی سے ۴۰ میل شمال میں واقع ہے۔ ایک اور نمونہ کبیر الدین اولیا کا مقبرہ ہے جو غیاث الدین تغلق دوم کے عہد میں تعمیر ہوا۔

خاندان سادات (۱۴۱۴ء۔ ۱۴۵۱ء)

اس عہد کے صرف مقبرے ہی پائے جاتے ہیں جو اس وقت شکستہ حالت میں ہیں:
(۱) مقبرۂ مبارک سید ۱۴۳۴ء
(۲) مقبرۂ محمد سید ۱۴۴۴ء

خاندانِ لودھی (۱۴۵۱ء۔ ۱۵۲۶ء)

(نوٹ:۔ گو خاندانِ لودھی کا خاتمہ ۱۵۲۶ء میں ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد خاندانِ سور (افغان) تک بلکہ اکبر کے عہد تک بھی عمارتیں اسی طرز کی بنتی ہیں جو خاندان لودھی کے دورِ حکومت میں رائج تھیں۔ اس لئے یہاں ان تمام عمارات کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس زمانہ میں تعمیر ہوئیں)
(۱) مقبرہ سکندر لودھی ۱۵۱۷ء دہلی۔
(۲) مقبرہ شہاب الدین تاج۔ دہلی

لودھیوں کے دورِ حکومت میں طرزِ تعمیر میں بہت کچھ فرق آگیا تھا جو ان مقبروں کے گنبدوں سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ سکندر لودھی کے مقبرہ پر دو گنبد ہیں۔ اس زمانے کے اور گنبد بھی جو مشہور رہتے۔ پرسی براؤن نے ان کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔
بڑے خان کا گنبد۔ چھوٹے خان کا گنبد۔ بڑا گنبد۔ چھوٹا گنبد۔
دادی کا گنبد۔ پوتی کا گنبد۔
اس زمانے میں جو مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ ان میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:

(۱) بڑے گنبد کی مسجد - دہلی ۱۴۹۴ء

(۲) جمالی مسجد - ۱۵۳۶ء

(۳) موٹھ کی مسجد - ۱۵۰۵ء (سکندر لودھی)

دہلی سے دور جو عمارتیں تعمیر ہوئیں - ان میں کالپی کا چوراسی گنبد اور ملت پور کی جامع مسجد ہے - ایک اور قابل دید عمارت جو ۱۵۹۴ء میں تعمیر ہوئی - وہ مقبرہ حضرت محمد غوث گوالیاری ہے جو گوالیار میں واقع ہے ۔

لودھیوں کے خاتمہ پر خاندانِ مغلیہ کا دور شروع ہوتا ہے ۱۵۲۶ء میں میدان پانی پت میں بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا - اس کی مدت حکومت چار سال تھی - بابر کی طبیعت گو باغات کی طرف مائل تھی - تاہم اس کے دور کی دو عمارتوں کا پتہ چلتا ہے - ان میں ایک تو سنبھل کی جامع مسجد ہے اور دوسری پانی پت کے کابلی باغ کی مسجد بتائی جاتی ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ بابر کو ہندوستان کی عمارتیں ناپسند تھیں - اس لئے اس نے ایک عثمانی (ترکی) انجینئر صنعان کی شہرت سن کر اس کو طلب کیا تھا - لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صنعان نہیں آیا - کیونکہ ہندوستان میں اس طرز کی عمارت نہیں پائی جاتی جیسی صنعان نے عثمانی سلطنت میں تعمیر کی تھیں ۔

بابر کے بعد اس کا فرزند ہمایوں تخت نشین ہوتا ہے - لیکن دس سال بعد شیر شاہ افغان تخت پر قبضہ کر لیتا ہے - اس کے مختصر عہد میں جو عمارتیں تعمیر ہوئیں - ان کے متعلق ماہرینِ فن تعمیر کی رائے ہے :-

" لودھیوں کے عہد میں سلطنت پر جو زوال آ رہا تھا - اس زمانہ کی عمارتیں

بھی اسی اداس صورت پر تعمیر ہو رہی تھیں۔ شیر شاہ سوری نے ان میں ایک نئی روح
پھونک دی جس کا سہرا علی وال خان معمار کے سر ہے۔"

(پرسی براؤن)

شیر شاہ کا عہد ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا ایک درخشاں عہد ہے جس طرح یہ نامور
شہنشاہ فنون جنگ کا اعلیٰ ترین ماہر تھا۔ اسی طرح ملکی و مالی انتظامات میں بھی ایک خاص
وصف کا مالک گذرا ہے۔ اس نے اپنے عہد میں بہت سی شاہراہیں اور سڑکیں بنائیں
اور ان پر مسافروں کے آرام کے لئے سرائیں اور لنگر خانے بنائے۔ ڈاک کا انتظام کیا۔
قلعوں کی تعمیر میں اس کو ایک خاص ملکہ تھا۔ تعمیرات میں جدت پیدا کرنے کے خیال
سے اس نے افغانستان سے علی وال خان انجینیر کو طلب کیا جس کی نگرانی میں اس کا
خاص مقبرہ افغانی طرز میں تعمیر ہوا۔ اس شہنشاہ کی سب سے بڑی یادگار سڑک اعظم" یا
گرانڈ ٹرنک روڈ ہے جو کلکتہ سے پشاور تک بنی ہوئی اب تک موجود ہے۔

شیر شاہ کے جانشین اس دل و دماغ کے نہیں تھے جن کا شیر شاہ مالک تھا۔ شیر شاہ
کی وفات کے دس سال بعد سلطنت ان کے ہاتھ سے پھر مغلوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ہمایوں
ایران سے واپس آگیا۔ بہر طور شیر شاہ کے افغان خاندان کے دور میں جو عمارتیں تعمیر
ہوئیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) شیر شاہ کا مقبرہ۔ سہسرام میں

قصبہ سہسرام، بہار میں شیر شاہ کا یہ مقبرہ ایک تالاب کے وسط میں بنا ہوا ہے
اس عمارت کی خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس کی تکمیل میں جملہ اشکال اقلیدس
ایک جگہ جمع کر دی گئی ہیں اور یہ سب سے بڑا ہندسی کارنامہ ہے جو علی وال خاں

کے سر ہے ۔ یہاں شیر شاہ کی صرف ایک انگلی دفن ہے ۔ باقی جسم کالنجر کی لڑائی کے وقت بارود سے اُڑ گیا تھا اور شاہی انگشتری سے پہچانا گیا کہ یہ انگلی تھی شیر شاہ کی ہے ۔

(۲) سلیم شاہ سوری کا مقبرہ ۔ سہسرام

(۳) قلعۂ کہنہ کی مسجد ۔ دہلی میں ۔ معروف بہ "شیر منڈل" جس کے مینار کے زینہ پر سے گر کر ہمایوں مرا تھا اور اپنے مرنے کی تاریخ پہلے سے کہہ گیا تھا ۔ "ہمایوں از بام افتاد"

(۴) بڑا دروازہ ۔ دہلی ۔

ہمایوں کو دہلی واپس آتے ہوئے پورا سال بھی نہیں گذرا تھا کہ اس کی وفات ہو گئی اور اس کا بیٹا اکبر تخت نشین ہوا ۔ اس کو عمارتیں بنوانے کا خاص شوق تھا ۔ اس نے خشت و گل کو چھوڑ کر سنگِ سرخ کے عمارتوں کی بنیاد ڈالی ۔

مغلوں کے اس تابناک دور کو شروع کرنے سے بیشتر ان تعمیرات کا ذکر بھی ضروری ہے جو دہلی سے دور صوبائی حکومتوں میں تعمیر ہوئیں ۔ محمد بن تغلق کے عہد ہی سے ہندوستان کے بعض دُور دراز صوبوں میں علیحدہ حکومتیں قائم ہونی شروع ہو گئی تھیں ۔ یہاں کے حکمرانوں نے بھی اپنے اپنے پایہ تختوں میں تعمیرات کیں اور بعض صوبوں میں جو دہلی کے ماتحت ہی رہے ، صوبہ داروں نے اپنے اپنے صدر مقاموں پر بھی عمارتیں بنوائیں ۔ ان میں قابلِ ذکر حسب ذیل تعمیرات ہیں ۔

۱ ۔ جونپور

(۱) اٹالہ مسجد ۱۴۰۸ء (۲) جامع مسجد ۱۴۷۰ء (تعمیر حسین شاہ) (۳) ابراہیم نائب باربک کی مسجد ۱۳۷۶ء (۴) شیخ بارہا کی مسجد ۱۳۱۱ء (ظفر آباد میں) (۵)

لال دروازہ مسجد ۱۴۵۰ء - ۱۴۳۶ء (یہ مسجد محمد شاہ کی بیگم بی بی راجہ نے بنوائی) جونپور کے شرقی خاندان نے بہت سی تعمیرات کی تھیں - اگر سلطان سکندر لودھی جونپور کو تباہ نہ کر دیتا تو شاید اور بہت سی قابل دید عمارتیں یہاں پائی جاتیں۔

۲۔ پنجاب

ملتان

(۱) مقبرہ شاہ بہاءاللہؒ (۲) مقبرہ شمس الدین تبریزیؒ ۱۲۷۶ء (۳) مقبرہ شاہ یوسف گردیزیؒ ۱۵۲۹ء (۴) مقبرہ شدنا شہیدؒ ۱۲۷۰ء (۵) مقبرہ شاہ رکن عالمؒ ۱۳۲۴ء۔

۳۔ کشمیر

سرینگر

(۱) جامع مسجد ۱۴۰۰ء۔ گو یہ مسجد خشت و گل کی ہے۔ لیکن لکڑی کا بہت زیادہ استعمال ہوا ہے (۲) خالص لکڑی کی بنی ہوئی مسجد "مسجد شاہ ہمدانؒ" ہے۔ جو کشمیری صناعوں کی مشہور صنعت ہے۔

(نوٹ:۔ لکڑی کی عمارتیں اکثر ان علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ جہاں برفباری ہوتی ہے یورپ میں بھی ملک سویڈن اور ناروے میں لکڑی کی عمارتیں بنائی جاتی ہیں)

(۳) قلعہ ہری پربت (۴) مسجد اخوند شاہ ملا (ہری پربت میں) ۱۶۴۹ء (۵) پتھر مسجد ۱۶۲۳ء (۶) پری محل (ڈھال پر) (۷) شالیمار باغ کی عمارت۔

۴۔ بنگال

گور (لکھنوتی)

(۱) مقبرہ فتح خان (۲) چھوٹا سونا مسجد (۳) ایک لاکھی مسجد (۴) داخلی دروازہ (قدم رسول ہیں) (۵) تانتی پاڑہ کی مسجد (۶) چمکاٹی مسجد ۱۴۷۵ء (۷) درس باڑی کی مسجد ۱۴۸۰ء (۸) لوٹن مسجد ۱۴۸۰ء (۹) گن منت مسجد ۱۴۸۴ء (۱۰) بڑا سونا مسجد ۱۵۲۲ء (۱۱) مسجد قدم رسول ۱۵۳۰ء (۱۲) فیروز مینار۔

۵۔ پنڈوہ

(۱) آدینہ مسجد (اس میں ۲۶۰ ستون تھے اور جامع مسجد دمشق کے نمونہ پر بنی تھی) (۲) مقبرہ سلطان جلال الدین محمد شاہ (۳) درگاہ بائیس ہزاری (۴) درگاہ حضرت مخدوم نور قطب عالم (۵) سنہری مسجد۔

(نوٹ :- گوڑ اور پنڈوہ۔ یہ دونوں شہر کبھی بنگال کے صوبائی پایہ تخت تھے۔ اب ویران ہو گئے ہیں)

۶۔ گجرات

کھمبایت۔ جامع مسجد ۱۳۲۵ء

چمپانیر۔ جامع مسجد ۱۴۵۶ء۔ نگینہ مسجد۔

پٹن ۔ جامع مسجد (آدینہ مسجد تعمیر الغ خان ۱۳۰۰ء۔ مقبرہ شیخ فرید رح ۱۳۰۰ء

بڑوچ ۔ جامع مسجد ۱۳۰۰ء

ڈھولکا۔ جامع مسجد۔ مسجد ہلال خان۔ ٹنکا کی جامع مسجد ۱۳۶۱ء۔ الف خان کی مسجد

سرکھیج۔ مقبرہ دریا خان۔ مقبرہ شیخ احمد کھتری۔ مسجد احمد شاہی

برہان پور۔ بی بی کی مسجد

تھالنیر۔ مقبرۂ خاندانِ فاروقی

احمد آباد۔ جامع مسجد ہیبت خان کی مسجد۔ سید عالم کی مسجد۔ احمد شاہی مسجد
احمد شاہ کا مقبرہ۔ رانی کا حجرہ (یہ ایک مقبرہ ہے جس میں احمد شاہ کی بیگمات کی مزارات
ہیں) قطب الدین کی مسجد۔ روضۂ ملک شعبان۔ روضہ سید بڈھا ابن سید یاقوت۔ سرکا
خان کی مسجد مسجد محافظ خان۔ روضۂ رانی سپاری۔ سدی سید کی مسجد۔ رانی روپ وتی کا
روضہ۔ رانی کی مسجد۔ تین دروازہ۔

مضافات احمد آباد میں عثمان پور میں:۔

روضۂ سید عثمان۔ مسجد میاں خان چشتی۔ بی بی اچھوت کوکو کی مسجد۔

۷۔ مانڈو اور دھار

جامع مسجد۔ جہاز محل۔ مقبرہ ہوشنگ شاہ۔ ہنڈولہ محل۔ اشرفی محل عمارت ہفت منزل

مانڈو سے باز بہادر اور روپ متی کے حسن وعشق کا افسانہ وابستہ ہے دریائے
تاپتی کے کنارے اس ویرانہ میں یہ عمارتیں جو فن تعمیر کے لحاظ سے بہت خوبصورت
تسلیم کی جاتی ہیں۔ اب بھی اپنی شکستہ حالت میں حسن وعشق کے اس مشہور افسانے
کو دہراتی ہوئی دعوت نظارہ دے رہی ہیں۔

۸۔ چندیری

کوشک محل۔ شاہزادی کا روضہ۔ بادل محل۔ جامع مسجد۔

۹۔ گلبرگہ

ہفت گنبد یعنی بہمنی بادشاہوں کے مزارات۔ دروازۂ درگاہ حضرت بندہ نوازؒ

۱۰۔ حیدرآباد دکن

چارمینار۔ مکہ مسجد (یادگار محمد قلی قطب شاہ)

(حیدر آباد کے قریب ہی گولکنڈہ میں قلعہ اور قطب شاہی بادشاہوں کے مزارات ہیں)

بیدر۔ رنگین محل۔ زنانہ محل اور حمام

بیجاپور۔ جامع مسجد ۱۵۵۷ء۔ روضۂ ابراہیم عادل شاہ ۱۶۰۵ء، مسجد ملحقہ روضہ

گول گنبد (مقبرۂ محمد عادل شاہ) مہتر محل۔

بیجاپوری تعمیرات: اپنی ایک خاص اور نہایت ہی خوبصورت طرز کے لئے مشہور ہیں جس میں عربی و ترکی طرزِ تعمیر کے ساتھ ساتھ جنوبی ہند کا طرزِ تعمیر بھی مل کر ایک جدید اور مستقل طرزِ تعمیر بن گیا جس کو ماہرین فن نے "بیجاپوری طرز" کا نام دیا ہے۔ بیجاپور اور اس کے مضافات میں بے شمار مقبرے اور مسجدیں شکستہ حالت میں اب بھی موجود ہیں۔ مولوی بشیرالدین احمد صاحب دہلوی نے اپنی تاریخ بیجاپور میں ان کی تفصیل دی ہے۔ ماہرین فن تعمیر لکھتے ہیں کہ "بیجاپور میں پچاس سے زیادہ وضع کی مسجدیں اور بیس سے زیادہ وضع کے مقبرے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر کو مرہٹوں نے برباد کر دیا تھا۔

سرا (علاقہ میسور)

شہر سرا، بنگلور سے ستر میل شمال میں واقع ہے۔ بیجاپور کے صوبہ دار کا صدر مقام تھا۔ بیجاپوری عہد میں یہاں بہت سی تعمیرات ہوئیں۔ بعد میں اس شہر پر جب مغلوں نے قبضہ کر لیا تو انھوں نے بھی کچھ تعمیرات کیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس شہر میں نوے سے زیادہ مسجدیں تھیں۔ اب سوائے دو چار کے باقی عمارتوں کا نشان بھی نہیں ہے۔ اس کے ایک خاص محلے میں جو پٹھان واڑی کہلاتا تھا، چودہ ہزار پٹھان خاندان آباد تھے۔ ان کی یادگار اب صرف ایک شکستہ مسجد ہے جس کا ایک مینار باقی ہے۔ اب اس شہر میں دو مسجدیں اور ایک مقبرہ قابل دید ہے۔

(۱) مسجد نجیب خاں احراری۔ عہد بیجا پور کی تعمیر اور بیجا پوری طرز کی ہے۔
(۲) جامع مسجد۔ عہد اورنگ زیب عالمگیر کی یادگار اور مغلیہ طرز کی ہے۔
(۳) مقبرۂ ملک ریحان۔ اس مقبرے کے پاس ایک احاطہ میں ایک چھوٹا سا مزار ہے۔ جس کے متعلق مشہور ہے کہ عالمگیر اورنگ زیب کی بیٹی کا ہے۔
(سر اکے مکمل حالات میری لکھی ہوئی کتاب "تاریخ جنوبی ہند" میں معہ فوٹو دیئے گئے ہیں)
(۴) بیجا پوری عہد کی ایک اور یادگار ضلع چتل درگ میں سنتے بنور میں ایک مسجد ہے جس کو پٹھانوں کی مسجد کہا جاتا ہے۔ امپریل گزیٹر آف انڈیا میں اس کا ذکر صفحہ ۱۳۱ اور صفحہ ۲۵۴ پر ہے۔ یہ مسجد فی الوقت حکومت کے قبضہ میں ہے اور اس کی واگذاشت کی کوشش کی جا رہی ہے۔

سرنگاپٹم (علاقۂ میسور) ۱۷۶۹ء ـ ۱۷۹۹ء

نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان شہیدؒ کی سلطنت خداداد کا پایہ تخت تھا۔ یہاں مسجد اعلیٰ[1] مسجد اقصیٰ اور گنبد اعلیٰ (جس میں نواب حیدر علی، ٹیپو سلطان شہیدؒ اور ان کی والدہ کے مزارات ہیں) بیجا پوری طرز تعمیر پر بنے ہوئے ہیں۔ ٹیپو سلطان شہیدؒ کے مشہور دریا دولت باغ کی عمارت اصفہانی طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔ ٹیپو سلطان شہیدؒ کی بنائی ہوئی

---

[1] اس مسجد کی دیواروں پر اندر کی طرف سبز رنگ (شیر کا رنگ) چڑھا ہوا تھا جس پر اب چونا پھیر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے چھت پر کاشی کاری کے جو نقش و نگار ہیں۔ وہ بھی اچھی طرح نظر نہیں آتے۔ کیونکہ ہر سال چونہ کی ایک تہہ پر دوسری تہہ چڑھتی جاتی ہے۔ کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ حکومت میسور اس آثار قدیمہ کو اپنی اصلی حالت پر بحال کر دے گی جو مشکل نہیں ہے۔ صرف چونے کو کھرچ کر رنگ اور روغن استعمال کرنا ہے۔ (محمود)

مسجدوں کو دیکھ کر حضرت علامہ اقبال نے کہا تھا :-

" تمام ہندوستان کی مسجدوں میں پھر جایئے۔ کیا شہنشاہوں کی بنائی ہوئی اور کیا عوام کی، کیا اسلامی عہد کی اور کیا انگریزی کے زمانہ کی۔ سوائے مسجد اعلیٰ کے آپ کسی بات میں یہ بات نہ پائیں گے۔ شاہ جہاں کی مسجدوں میں آیہ "لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ" الخ " پڑھکر دل خوش ہوتا ہے کہ اتنی عظیم الشان بناؤں کی تعمیر کرتے وقت شاہ جہاں کے دل سے مسجد نبوی کا احترام نہیں گیا۔ مگر مسجد اعلیٰ کو دیکھ کر شاہ جہاں کی مسجدوں کی خصوصیت بھی اتنی اہم نہ رہ گئی "۔
(تاریخ سلطنت خداداد)

دریا دولت باغ کے متعلق سیاح ریس (Rees) لکھتا ہے :-

" مجھے سرنگاپٹم میں دریا دولت باغ دیکھ کر اصفہان کے محل یاد آگئے۔ اس محل کا نقش و نگار جو اس کے ایک ایک انچ پر کیا ہوا ہے، دیکھ کر حیرت ہوتی ہے تمام ہندوستان میں اس قدر منقش و دلفریب عمارت اور کوئی نہیں ہے "۔

ٹیپو سلطان نے بنگلور میں بھی ایک خالص عربی طرز کی ایک مینار والی مسجد گوری پور میں تعمیر کی تھی جو زوال سلطنت خداداد کے بعد شہید کر دی گئی۔ اس سلطان کی بنائی ہوئی ایک اور مسجد چیل ورگ میں واقع ہے اور ایک سیلم میں ہے جس کو جامع مسجد کہا جاتا ہے

صوبائی تعمیرات کے ذکر کے بعد اب ہم پھر اس سلسلہ کی طرف لوٹتے ہیں جس کو شیر شاہ کے افغان خاندان کی تعمیرات پر چھوڑ آئے تھے۔ شہنشاہ اکبر کو عمارتوں کا جس قدر شوق تھا۔ وہ اس کی بے شمار عمارتوں سے ظاہر ہے جو اس نے آگرہ سے کچھ فاصلہ پر فتح پور سیکری میں تعمیر کی تھیں۔ اکبر کے شروع دور میں ہمایوں کا مقبرہ دہلی میں تعمیر ہوا جو آج بھی عمدہ حالت میں باقی ہے۔

ہمایوں کا یہ مقبرہ ہمایوں کی بیوی حاجی بیگم کی خاص نگرانی میں تعمیر ہوتا ہے۔ ماہرین فن کی رائے ہے کہ یہ خالص ایرانی طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ ہمایوں اور اس کی بیگم ہندوستان سے نکل کر ایک عرصہ تک پناہ ڈھونڈتے رہے تھے۔ ایران کی اقامت کے زمانے میں یہاں کی طرزِ تعمیر کا ان پر نہایت اثر پڑا۔ ہندوستان واپس ہونے کے بعد ایک ایرانی انجینئر میرک میرزا غیاث کو ہندوستان میں طلب کیا گیا اور یہ مقبرہ اسی انجینئر نے بنایا۔

اکبر نے تخت نشین ہوتے ہی قلعہ آگرہ کا دہلی دروازہ تعمیر کیا۔ اکبر کے متعلق مشہور ہے کہ اس کو ہر طرح کی طرزِ تعمیر کا شوق تھا۔ اسی لئے اس نے ہندوستان کے ہر حصہ سے معماروں اور صناعوں کو بلا کر عمارتیں بنوائیں۔ اسی لئے اس کی عمارتوں میں ہندوستان کے تمام مروجہ طرز تعمیر کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ رعایا پروری کے خیال سے اس نے اس قدر عمارتیں بنوائیں۔ کہ آئینِ اکبری کا مصنف لکھتا ہے:۔

"قلعہ کے اندر بنگال اور گجرات کے نمونہ کی پانچ سو عمارتیں تعمیر ہوئیں"۔

ان میں بہت سی عمارتیں شاہ جہان کے عہد میں ڈھا دی گئیں اور ان کی جگہ سنگِ مرمر کی عمارتیں تعمیر ہوئیں اور اب بھی کئی عمارتیں جن میں سنگِ سُرخ کے ساتھ سنگِ مرمر بھی ملا ہوا ہے آگرہ میں باقی ہیں جو اکبر اور شاہ جہان دونوں کی یاد دلاتی ہیں۔ ماہرینِ فن تعمیر کی رائے ہے کہ تاج محل کو چھوڑ کر مغلوں کا سب سے بڑا کارنامہ فتحپور سیکری کی تعمیر ہے جو آگرہ سے ۲۶ میل دور جانبِ مغرب ہے۔ آج اس ویرانہ پر اور اکبر کی تعمیرات پر حسرت برس رہی ہے اس جگہ اکبر نے کئی عمارتیں بنوائیں۔

نوبت خانہ۔ دیوان عام۔ جامع مسجد۔ سنگ سازوں کی مسجد۔ مقبرہ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ۔ بلند دروازہ۔ محلات میں جودھ بائی کا محل (راجپوتی طرز) مریم زمانی کا محل۔ سلطانہ کا

محل (ترکی طرز) بیربل کا محل (ہندی طرز) جہانگیری محل۔ ہوا محل۔ دیوانِ خاص۔ پنج محل اور اور خوابگاہ۔ الٰہ آباد میں قصرِ چہل ستون۔

اکبر اور شاہ جہاں کے عہدِ حکومت کے درمیانی وقفے میں سکندرہ (آگرہ) میں اکبر کا مقبرہ۔ جالندھر (پنجاب) کی سرائے کے پاس دروازہ۔ لاہور میں شاہدرہ کے قریب دریائے راوی کے کنارے جہانگیر کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ جہانگیر کی وفات کے بعد ملکہ نور جہاں کی نگرانی میں اس کا بہت سا حصہ تعمیر ہوا۔ نور جہاں کا مقبرہ بھی لاہور ہی میں ہے۔ ایک اور قابلِ ذکر عمارت جو اس درمیانی عرصہ میں تعمیر ہوئی۔ وہ آگرہ میں مقبرۂ اعتماد الدولہ کی ہے۔ یہ مقبرہ ۱۶۲۸ء میں تعمیر ہوا۔ اس میں سنگِ مرمر لگا ہوا ہے۔

اکبر کے بعد تعمیری لحاظ سے شاہ جہاں کا وہ زرّین عہد ہے جس کو عہدِ مرمریں کہا جاتا ہے شاہ جہاں کی نفاست پسند طبیعت۔ اس کا ذوقِ حسن۔ اس کا جمالیاتی نظریہ۔ اس کا حسین تخیل۔ ان سب چیزوں نے مل کر اس کی عمارتوں میں ایک ایسی خوبصورتی پیدا کر دی۔ کہ دنیا میں ان کا جواب نہیں ملتا۔ شاہ جہاں نے دہلی اور آگرہ میں بہت سی عمارتیں بنوائیں دہلی میں لال قلعہ اور اس کے محلات خصوصاً رنگ محل۔ دیوان خاص اور دیوانِ عام خوبصورتی کا وہ لاجواب مظہر ہیں کہ دیکھنے والے کی زبان پر بے ساختہ یہ شعر آجاتا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمین است و ہمین است و ہمین است

اور یہی شعر ایک خوبصورت کتبہ میں دروازے پر کندہ بھی ہے۔ جمنا سے کاٹ کر ایک نہر "نہرِ بہشت" ان محلات میں لائی گئی ہے۔ رنگ محل کو دیکھ کر ایک مورخ نے لکھا ہے:۔

" وعدہ شدہ جنت کے قصرات مشیدہ سے بھی یہ عمارت رنگ اور خوبصورتی

میں بڑھ گئی ہے "

کتاب تمدن عرب کے مصنف نے لکھا ہے:۔

دہلی کا بادشاہی قصر۔ اس قصر کو شاہ جہان نے بنایا اور اس کی تعمیر ۱۰۵۸ھ یعنی ۱۶۴۸ء میں ختم ہوئی۔ اس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ پُرشان کوئی اسلامی قصر ہندوستان و ایران میں نہیں ہے۔ اس کے ایوانوں کی مختلف الالوان پتھروں کی پچی کاری ہر ایک میں گنگا جمنی کا لطف دکھاتی ہے اُن کل وحشی اقوام کے ہاتھوں سے جنہوں نے متعدد اوقات میں دہلی کو لوٹا ہے یہ قصر جو فی الواقع عجائبات دنیا میں سے ہے بچا رہا۔ لیکن انگریزوں نے اس پر رحم نہ کھایا۔ انہوں نے فقط اُن ہی ایوانوں کو قائم رکھا ہے جو کبھی اُن کے کام میں آ سکیں چونکہ ان میں نہایت نازک رنگین پتھر جڑے ہوئے تھے اور فوجی طویلے اور گوروں کی خوابگاہیں بننے کے بعد ان کا صاف کرنا کسی قدر دشوار تھا۔ اس لئے انہوں نے بہت اہتمام کے ساتھ ان پُرتکلف دیواروں پر چونا پھیر دیا۔ مگر اُن کی اس حرکت پر اس قدر شور و غل مچا کہ ان جدید ملک گیران ہندوستان کو ضرورت پڑی کہ اپنے جمائے ہوئے چونے کو کھرچ ڈالیں۔ اس طرح پر جو کچھ بچ بچایا گیا ہے اُس سے کافی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس قصر کی حالت بربادی سے پہلے کیا تھی

موسیو روسلے بیان کرتے ہیں:۔

" اس قصر کا اندرونی حصہ اس قدر پُرتکلف ہے کہ نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سُنا۔ ستونوں، محرابوں اور دالانوں کی چھت کے حاشیوں پر عجیب و غریب عربی حروف کی گلکاریاں رنگ برنگ کے قیمتی پتھروں کی جو سنگ مرمر میں جڑے

بنی ہوئی ہیں۔ آفتاب کی کرنیں جس وقت ان محرابوں میں سے ہو کر اس وجد میں لانے والی پچیکاری پر پڑتی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پھولوں کے ! جو سنگ زنگار اور مختلف اقسام کے بلوروں اور دوسرے پتھروں سے بنے ہوئے ہیں۔ گویا زندہ ہو گئے ہیں"

(تمدن عرب صفحہ ۱۹۲)

یہاں بھی ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے جس کو "موتی مسجد" کہتے ہیں۔ شہر میں جامع مسجد اسی عمارت گر شہنشاہ کی یادگار ہے جس کی بنیاد ۱۶۴۲ء میں رکھی گئی اور اختتام ۱۶۵۴ء میں ہوا۔ یہ ہندوستان کی سب سے بڑی مسجد شمار کی جاتی ہے۔ اس مسجد کے متعلق ڈاکٹر گستاولی بان نے لکھا ہے :-

> "یہ شاندار عمارت قلعہ کے میدان کے سرے پر واقع ہے اور اس میں جانے کیلئے بڑی بڑی سیڑھیاں ہیں جو ایرانی طرز کے دروازوں تک منتہی ہوتی ہیں مسجد کی تعمیر سنگ سرخ سے ہوئی ہے۔ روکار پر سفید سنگ مرمر اور سنگ موسٰے نہایت اُستادی سے لگایا گیا ہے"
>
> (تمدن عرب صفحہ ۱۹۱)

شاہ جہان نے ۱۶۳۸ء میں ایک نئی دہلی بھی بسائی جس کو "شاہ جہان آباد" کہا جاتا ہے۔ مورخوں کا اس کے متعلق خیال ہے کہ "شاہ جہان کو اپنا پایہ تخت آگرہ سے دہلی بدلنے کا تھا" اسی عمارت گر شہنشاہ نے لاہور میں اکبر کی بنائی ہوئی عمارتوں میں ترمیم کی۔ یہ ترمیم قلعہ لاہور کے شمالی حصہ میں نمایاں نظر آتی ہے۔ جہاں خواب گاہ، شیش محل، ثمن برج اور نولکھا کی عمارتیں نظر آتی ہیں۔

مغلیہ طرز کا بہترین نمونہ لاہور میں مسجد وزیر خاں ہے جو ۱۶۳۴ء میں تعمیر ہوئی۔ اسی طرز نمونہ پر لاہور میں کئی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ گلاب باغ کا دروازہ، چوبرجی، علی مردان خان کا مقبرہ۔

مقبرہ شرف النساء۔ شالامار باغ۔ دائی انگا کی مسجد۔ اور آصف خان کا مقبرہ یہ سب کے سب مغلیہ طرزِ تعمیر کے نمونے ہیں۔ لاہور میں اگر مغلیہ طرز پر عمارتیں تعمیر ہوئیں تو آگرہ میں پنجابی طرز پر چینی کا روضہ تعمیر ہوا جو افضل خان لاہوری کا مقبرہ ہے۔ اسی طرز پر متھرا کی جامع مسجد بھی بنی گو دہلی کا لال قلعہ اور اس کے محلات خوبصورتی و نفاست میں اپنا نظیر نہیں رکھتے لیکن آگرہ اپنے تاج محل اور موتی مسجد کی وجہ سے دہلی پر بھی فوقیت لے گیا۔ یہاں شاہ جہان نے قلعہ میں سب سے پہلے ۱۶۳۷ء میں دیوانِ عام کی تعمیر کی۔ موتی مسجد کی تعمیر ۱۶۵۴ء میں ختم ہوئی یہ وہ مسجد ہے جو دُنیا کی تمام مسجدوں میں سب سے خوبصورت تسلیم کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر گستاولی بان اپنی کتاب "تمدن عرب" میں لکھا ہے:۔

"آگرہ کی موتی مسجد" میں آگرہ کی مشہور عمارات کے منجملہ موتی مسجد کا بھی بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اس عمارت کو اُس نے ۱۶۵۶ء میں تعمیر کیا تھا۔ بشپ ہیبر انگریزوں کا رئیس الاساقفہ لکھتا ہے کہ اس مسجد کے دیکھنے کے بعد مجھے سخت شرم آئی کہ میرے مذہب کے معماروں نے کبھی کوئی ایسی عمارت نہیں بنائی جو اس خانۂ خدا کا مقابلہ کر سکے"۔ (تمدن عرب صفحہ ۱۹۱)

دیوانِ عام اور موتی مسجد کی تعمیر کے درمیانی عرصہ میں خاص محل۔ شیش محل۔ نگینہ مسجد اور ثمن برج تیار ہوئے۔ اسی شہنشاہ نے ۱۶۳۱ء میں اپنی محبوب ملکہ ممتاز محل کی وفات پر دُنیا کے اس سب سے خوبصورت اور مرمریں مقبرہ کی بنیاد رکھی جس کا نام "تاج محل" ہے۔ موتی مسجد اگر عبادت گاہوں میں اپنا نظیر نہیں رکھتی تو تاج محل بہ حیثیت ایک عمارت اور مقبرہ کے "تعمیرات عالم کا تاج" بن گیا۔ اس کی مسحور کن خوبصورتی ہر موسم اور دن اور رات کی ہر ساعت میں ایک نیا اور حیران کن نظارہ پیش کرتی ہے۔ تاج اگر چاند کی روشنی میں ایک نرم آئینہ

مرمریں خواب ہے تو سورج کی تیز دھوپ میں وُہ ایک شعلہ جوالہ نظر آتا ہے۔ صبح سویرے سورج کی ہلکی اور زرد شعاعیں اس کو سنہری رنگ میں رنگ دیتی ہیں تو شام کو شفق ایک ہلکا سا گلابی رنگ لے آتی ہے جس پر گلاب کی پتیاں بھی شرما جاتی ہیں۔ تاروں بھری رات میں اس کا گنبد خلا میں ایک بڑا سا موتی بن کر آویزاں ہوتا ہے تو شب مہتاب میں معلوم ہوتا ہے کہ چاند آسمان سے اُتر کر "تاج" میں جذب ہو گیا ہے۔ ایک مصور کا خیال ہے کہ "شاہ جہان کی آنکھ میں ملکہ کی وفات سے جو آنسو بھر آئے۔ اُن میں سے ایک قطرہ منجمد ہو کر سنگ مرمر کے روضہ میں تبدیل ہو گیا"

سب سے بڑھ کر تعجب کُن امر یہ ہے کہ تاج بنیاد سے لے کر چوٹی تک نسائیت میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی ہر چیز سے نسائیت اس طرح نمایاں ہے کہ گویا کسی عورت کی رُوح اس میں کارفرما ہے۔ اسی چیز کو دیکھ کر شاید ٹالبائی وہیلر نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۵۶ پر لکھا ہے:

"یہ مقبرہ شاہ جہان نے اپنی بیگم ممتاز محل کے لئے بنایا جو نور جہاں کی بھتیجی اور آصف جاہ کی دختر تھی۔ اس عمارت کی رُوح سراسر نسائیت سے بھری ہوئی ہے۔ اس عمارت میں کہیں کوئی مردانہ کرختگی نہیں پائی جاتی۔ یونان اور روما کی تعمیرات اس کا جواب نہیں ہو سکتیں۔ یہ اس قدر خوبصورت ہے کہ الفاظ اس کو ادا نہیں کر سکتے۔ مگر یہ خوبصورتی نسائیت کی ہے۔ یہ ایک بیوی کا مقبرہ نہیں بلکہ دلوں پر حکم کرنے والی دیوی کا معبد ہے جس سے دل و دماغ میں ایک مرمریں خوبصورتی کا تصور جم جاتا ہے۔ دیوی گو بے جان ہے لیکن اس کا جسم ابھی تک موجود ہے۔ دیواریں اگر بعینہٖ مزلن کے اُن ملبوسات کی طرح ہیں جن میں پھول اور ہیرے جواہرات ٹکے ہوئے ہیں تو دروازے اس

زریں اور جالی دار نقش کی مانند نظر آتے ہیں جو کسی دلہن کے چہرہ پر پڑا ہوا ہو۔
"تاج" ایک خالص مشرقی تعمیر ہے جس کو ہندوستانی معماروں نے تعمیر کیا۔ پرسی براؤن اور ڈاکٹر گشاولی بان اور دوسرے ماہرینِ فنِ تعمیر نے اس کو تسلیم کر لیا ہے کہ تاج کی تعمیر صرف مشرقی طراحوں اور معماروں نے کی ہے۔ تاج کے متعلق جس قدر غلط روایات بھی آج تک مشہور تھیں۔ سب کی سب اب دیوان مہندس کے اس نسخہ کی دریافت سے غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ تاج کی بنیاد رکھنے والا صناع "احمد لاہوری" تھا اور اسی صناع نے دہلی کا لال قلعہ اور اس کے محلات بھی بنائے اور اس وقت جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تاج کی تخلیق ہندوستان کے معماروں کے کمال فن کا نتیجہ ہے تو تاج کی خوبصورتی کو دیکھ کر میں مجبور ہوں کہ اس افسانہ کو پیش کروں۔

• ہندوستان کا تاجدار شہنشاہ شاہجہان۔ اپنے دیوانِ خاص میں اپنی محبوب ملکہ کی یاد میں سوگوار بیٹھا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں ملکہ کی اس وصیت نے گھر کر رکھا ہے کہ "میرا مقبرہ دنیا میں بے مثال ہو۔" مغل اعظم کی آنکھوں میں آگرہ اور دہلی کی عمارتیں پھر رہی تھیں۔ ایک طرف اگر ہمایوں اور اعتماد الدولہ کے مقبرے دعوتِ نظر دے رہے تھے تو دوسری طرف دکن کی عمارتیں اور خصوصاً بیجاپور کا طرزِ تعمیر توجہ کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ شہنشاہ کے دل نے گوارا نہ کیا کہ کسی کی تقلید کی جائے۔" "ملکہ کا مقبرہ بے مثل ہونا چاہئے۔"
صناعانِ عالم کو دعوت دی گئی تھی کہ اپنے اپنے نمونے پیش کریں۔ دنیا کے ماہرینِ فن حاضر تھے۔ یورپ کا معمار آگے بڑھا اور ایک نمونہ شہنشاہ کے روبرو رکھ دیا۔ شہنشاہ کے ذوقِ حسن کو ٹھیس لگی۔ ترکی کا معمار اپنا نمونہ لے آیا

فلسفۂ حسن کے اس ماہر شہنشاہ کے دل کو تسکین نہیں ہوئی۔ عرب کے معمار نے اپنا نمونہ پیش کیا۔ نمونہ اچھا تھا۔ لیکن شہنشاہ کا جمالیاتی نظریہ کچھ اور ہی تھا چین کی صناعی پیش ہوئی۔ یہ روح سے بالکل معرّا تھی۔ ایرانی معمار اپنا بنایا ہوا نمونہ لایا شہنشاہ کی جدت پسند طبیعت پہ ناگوار گذرا۔ نقیب شاہی کی آواز آئی "حضورِ عالم! نمونے ختم ہو گئے"۔ اس آواز کے ساتھ ہی شہنشاہ پر ایک یاس کا عالم چھا گیا۔ اس مایوسی پر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ دیکھ کر ہندوستان کا دل تڑپ اٹھا۔ شہنشاہ اس کا تھا اور ملکہ بھی اس کی اپنی۔ ہندوستان کا معمار اصد ادب آگے بڑھا۔ اُمید و بیم کی حالت میں اُس نے اپنا نمونہ شہنشاہ کے آگے رکھ دیا۔ شہنشاہ کی نظر اٹھی اور نمونہ میں جذب ہو کر رہ گئی حسن و جمال کے اس چھوٹے سے مجسمے میں ملکہ کی روح جلوہ گر تھی۔ شہنشاہ کی آنکھ جس چیز کو ڈھونڈھ رہی تھی وہ اس نمونے میں موجود تھی۔ یہ ہندوستان کا خراجِ عقیدت تھا جو رعایا اپنی محبوب ملکہ کی خدمت میں پیش کر رہی تھی۔ شہنشاہ کے دل نے کہا "ملکہ کی بارگاہ میں رعایا کی نذرِ عقیدت قبول ہے"۔ نمونہ پسند کر لیا گیا۔ معمار کو حکم ہوا۔ کہ تعمیر شروع ہو"۔

غرض تاج خاص معمارانِ ہند کی صناعی کا ایک لاجواب شاہکار ہے۔ شاہ جہان کے بعد عالمگیر اورنگ زیب تخت نشین ہوا جس کے عہد میں مندرجہ ذیل تعمیرات ہوئیں:

مقبرۂ رابعہ دورانی۔ اورنگ آباد دکن میں یہ مقبرہ بالکل تاج ہی کے نمونہ پر تعمیر ہوا۔ لیکن خشت و گل کی عمارت ہونے کی وجہ سے تاج کی خوبصورتی سے معرّا ہے۔ اس کی تعمیر تاج محل کے معمار احمد کے بیٹے عطا اللہ نے کی جس کا نام کتبہ میں پایا جاتا ہے۔ عالمگیر کی دوسری تعمیرات

ہیں۔ بادشاہی مسجد لاہور۔ مسجد وزیر خان۔ جامع مسجد متھرا۔ جامع مسجد بنارس اور جامع مسجد سرا (علاقۂ میسور) ہیں۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد ہی جس طرح سلطنت پر زوال آنا شروع ہوا۔ اسی طرح فنِ تعمیر میں بھی زوال کے آثار شروع ہو گئے۔ بقول ماہرینِ فنِ تعمیر مقبرہ صفدر جنگ دہلی۔ رومی دروازہ لکھنؤ اور امام باڑہ آصف الدولہ لکھنؤ زوالِ فن کا ایک بین نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ابتدا اگر قطب مینار سے تھی تو انتہا امام باڑہ پر ہوئی۔ یا دوسرے الفاظ میں آغاز اللہ اکبر سے ہوا تو خاتمہ ماتم و سینہ کوبی پر۔ عبرت

"وتلک الایام نداولھا بین الناس"

محمود

بنگلور

ــــ دہلی کے برائے نام آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر نے بھی قطب صاحب دہلی میں ایک عمارت بنائی تھی جس کا نام ظفر محل۔ اس محل کے اندرونی مکانات اب ٹوٹ گئے ہیں۔ بہادر شاہ اس جگہ دروازے سے بیٹھ کر "سیر گلفروشان" کا
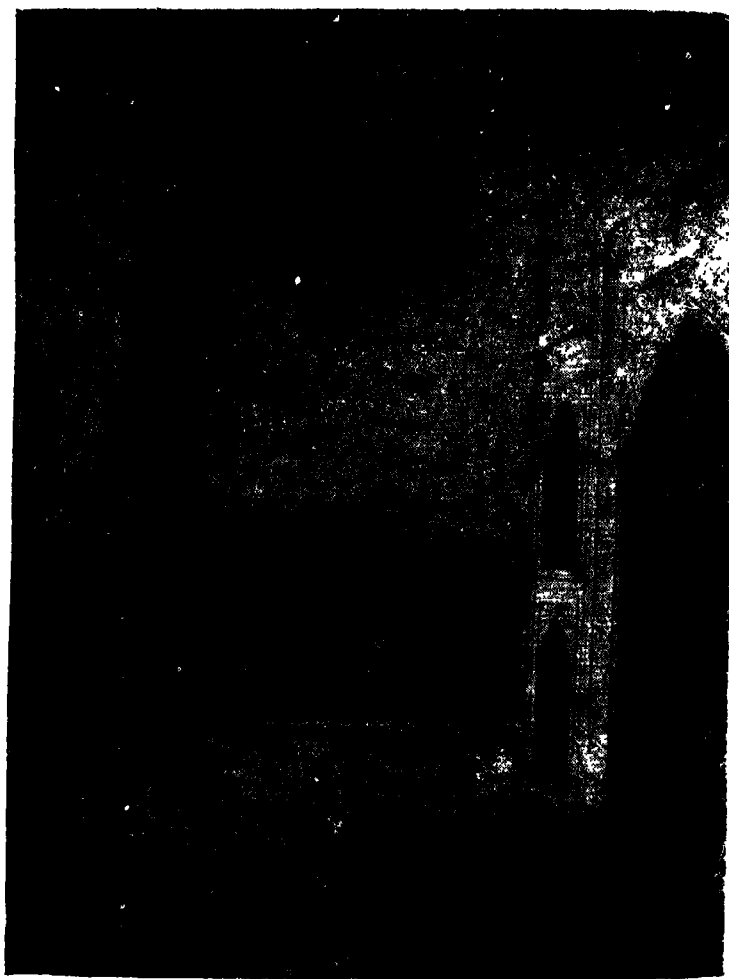
ایک مینار سے تاج کا منظر

تاج محل اور لال قلعہ کے معمار

از حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ ـــ مدیر معارف

(یہ مقالہ ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے اجلاس میں پڑھا گیا۔ اب مزید نئے معلومات کے اضافہ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے)

ہندوستان کے ارباب کمال میں خدا جانے کتنی ہستیاں ہیں جو گمنامی کے پردہ میں اس طرح چھپی ہیں کہ آج ہزار تلاش اور جستجو پر بھی ان کا سراغ نہیں لگتا۔ اس ملک میں تاریخ نویسی کا رواج بہت کم تھا۔ گو مسلمانوں کے آنے کے بعد تاریخ کی کچھ کچھ روشنی پھیلنے لگی تھی۔ پھر بھی بادشاہوں کے ایوانِ تاریخ سے باہر بدستور اندھیرا چھایا رہا۔ شاعروں نے البتہ اپنے تذکروں کی محفل میں شمع جلائی مگر اس کی روشنی اتنی مدھم ہے کہ خود ان کی صورتیں بھی اس سے پہچان میں اچھی طرح نہیں آتیں۔ روحانی بزرگوں کے مزاروں پر بھی چراغ جلائے گئے ہیں مگر ان سے بھی تبرکات

اور کرامات کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا، اگر ملا بدایونی، شاہ عبدالحق دہلوی اور آزاد بلگرامی نہ ہوتے تو جو کچھ بھی ہم کو معلوم ہے۔ وہ بھی ہم کو معلوم نہ ہو سکتا۔

لاہور کے جس مہندس خاندان کا حال آج ہم کو سناتا ہے۔ افسوس ہے کہ تاریخوں میں نام کے سوا اس کے کسی رکن کا حال بھی مجھے معلوم نہیں ہوا۔ حالانکہ ان کی بنائی ہوئی عمارتیں تاج آگرہ، لال قلعہ اور جامع مسجد دہلی ہمیشہ سے مشہور روزگار ہیں، مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ جن باکمالوں نے فن کی ندرت کا یہ کمال دکھایا ہے۔ کاغذ کے پرانے اوراق میں بھی ان کا نام و نشان نہیں ملتا۔

شاہجہان کی تاریخوں میں اس کے سال ششم میں روضۂ تاج محل کے بننے کا پورا حال، ایک ایک چیز کی پیمائش کے ساتھ لکھا ہے مگر جن نادرہ کار مہندسوں، نقاشوں اور طراحوں نے اس کا خاکہ کھینچا اور جن معماروں نے ان کو بنا کر تیار کیا۔ ان غریبوں کے نام تک بھی ان اوراق میں جگہ نہ پا سکے اور آج کل کے محققین بڑی چھان بین کے بعد بھی ان کا پتہ لگانے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔

اس خاندان کے بعض ارکان کے نام مصنف کی حیثیت سے بعض کتب خانوں کی فہرستوں میں مذکور ہیں مگر ان میں بھی نام کے سوا کچھ اور نہیں اور نہ ان افراد کے باہمی تعلق کا ذکر ہے بلکہ ان کی حیثیت بیگانہ افراد انسانی کی ہے۔

دیوان مہندس کا نسخہ

پورے دو برس ہوئے کہ ایک کرمفرما نے بنگلور سے مجھ کو اطلاع دی کہ ان کے پاس مہندس نام ایک شاعر کا فارسی دیوان ہے، اور دریافت کیا کہ کیا آپ اس شاعر سے واقف ہیں۔ میں نے لکھا کہ آپ وہ نسخہ مجھے بھیج دیں تو میں اپنی رائے ظاہر کروں۔ موصوف نے بڑی مہربانی فرما کر نسخۂ مذکور میرے پاس بھیج دیا۔ میں نے اس شخص کی تلاش میں اکثر تذکرے دیکھے۔ لیکن کہیں

کچھ پتہ نہ چلا مگر خوش قسمتی سے خود اس دیوان میں شاعر کی ایک مثنوی مل گئی جس میں اُس نے اپنے خاندان کا مختصر حال خود لکھا ہے۔ اس کو پڑھ کر میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی کہ یہ معمار و انجینیروں کی طرف سے پہلی آواز تھی جس میں تاج اور لال قلعہ کے بنانے کا دعوےٰ کیا گیا تھا اس مثنوی سے نہ صرف شاعر کی، بلکہ شاعر کے باپ اور بھائیوں کے حالات بھی معلوم ہوئے اور اس کے دوسرے قصائد اور اشعار سے یہ بھی قیاس میں آیا کہ اس باکمال خاندان کی گمنامی کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔

شاعر کا نام لطف اللہ اور تخلص مہندس ہے، مہندس کے معنی علم ہندسہ جاننے والے یعنی انجینیر کے ہیں اور اُس کا یہ دیوان چند قصیدوں، بعض مثنویوں اور بہت سی غزلوں پر مشتمل ہے اور یہ سب فارسی میں ہیں۔

دیوان کا کوئی دوسرا نسخہ مجھے نہیں ملا۔ زیرِ نظر نسخہ چھوٹی تقطیع کے ۹۶ صفحوں پر حاوی ہے۔ دیوان کے حصہ غزل کے خاتمہ تاریخ اتمام "۶ ر شہر ذی الحجہ ۴۷ھ بوقت شب تحریر یافت" لکھا ہے اور دیوان کے خاتمہ پر اس کتاب کی خریداری کی تاریخ لکھی ہے:-

"بتاریخ بستم رمضان المبارک ۱۱۵۰ھ دیوان مہندس خرید شد بسرکار نواب ابراہیم خان بہادر"

اور کتاب کے اندر بعض تاریخی قطعات ہیں جن میں سب سے آخری تاریخ ۱۰۶۶ھ کی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر یہ "۶ ر شہر ذی الحجہ ۴۷ھ ہجری سنہ ہے تو وہ یقیناً ۱۱۴۷ھ ہے۔ ورنہ میرا شبہ اس بنا پر کہ یہاں صرف ۴۷ھ لکھا ہے اور سیکڑہ نہیں لکھا ہے، یہ ہوتا ہے

---

[1] بعض تذکروں میں مہندس کے بیٹے ریاضی کے ضمن میں مہندس کا نام مذکور ہے۔ (س)

لہ یہ سنہ ہجری نہیں بلکہ سنہ جلوس ہے۔ اب ۱۰۶۶ھ کے بعد اور ۱۱۵۷ھ کے بیچ میں ایسا بادشاہ جس کو جلوس کا سینتالیسواں سال نصیب ہوا ہو۔ اورنگ زیب عالمگیر کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ ۴۷ سنہ جلوس عالمگیری ۱۱۱۵ھ کے مطابق ہے۔

اس نسخہ کے صفحۂ اوّل پر عمدہ جلی نستعلیق سے "این کتاب سر(کار) نواب بہادر....." لکھا ہے۔ باقی حروف کٹ گئے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس نسخہ کی تقطیع پہلے بڑی تھی جلد بندی کے وقت کچھ حاشیہ کاٹ دیا گیا ہے۔ اس کے نیچے "این کتاب سرکار نواب ابراہیم خان بہادر ہزبر جنگ بکتاب خان (بکتاب خانہ ؟) داخل شد" اس پر ایک مہر بھی تھی جو کسی نے مٹا دی ہے۔

شاعر کا نام لطف اللہ اور تخلص مہندس سن چکے اور وہ اپنے باپ کا نام احمد معمار بتاتا ہے۔ معمار احمد کا پیشہ ہے۔ نام کا جز نہیں۔ اس کے ایک قطعہ میں اس کا شاہی لقب "نادر العصر" مذکور ہے۔ اس شاعر کی بعض اور تحریریں بھی ہم کو دستیاب ہوئی ہیں جن میں وہ اپنے باپ کو لزوماً "استاد احمد لاہوری" لکھا کرتا ہے۔ اب ان ٹکڑوں کے جوڑنے سے احمد کا پورا نام ولقب "نادر العصر استاد احمد لاہوری" ثابت ہوتا ہے۔

نادر العصر استاد احمد لاہوری

اس نادر العصر کے حالات کا سُراغ تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ البتہ قلعۂ دہلی کی تعمیر کے سلسلہ میں مورخوں نے کہیں کہیں اس کا نام لیا ہے۔ محمد صالح کنبوہ نے عمل صالح میں جو شاہجہان کی معاصر تاریخ ہے۔ شاہجہان آباد کے عمارات و قلعہ کی تعمیر کے بیان میں اس کا نام ان لفظوں میں لیا ہے۔

• ازشب جمعہ بست و پنجم ذی حجہ مطابق نہم اردی بہشت سال دوازدہم از

جلوس اقدس مطابق یک ہزار و چہل و ہشت[1] ہجری در زمانِ محمود و آوانِ معود استادِ
احمد و حامد[2] سر آمد معمارانِ نادرہ کار بسرکاری غیرت خان صوبہ دار آنجا و صاحب
اہتمام این کار مطابق طرحے بدیع و نقشے تازہ کہ بہ ہیچ وجہ نظیر آں در کشش جہت
دُنیا بہ نظر نظارگیان نیامدہ بود رنگ ریختہ" (جلد ۳ ص ۲۸، کلکتہ)

مدرسہ دیوبند کے کتب خانہ میں ایک قلمی کتاب تاریخ شاہجہان کے نام سے ہے۔
جس کا نمبر ۳۲۳۴ ہے۔ اس میں چند صفحے باب قلعۂ شاہجہان آباد کے عنوان سے شاہجہان
آباد اور شالامار باغ کی تعمیر کے حالات میں ہیں۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل عبارت ہے:-

"بحکم اشرف بعد از پنج ساعت از شب جمعہ بست و نہم ذی الحجہ مطابق
امدی ہشت سال دوازدہم از جلوس اقدس شاہجہانی موافق سنہ ہزار و چہل
و ہشت ہجری کہ مختار دانشوران انجم و افلاک بود، استاد احمد و استاد حامد کہ
معماران ماہر بودند در کار عمارت سر آمد، بسرکاری غیرت خان برادر زادہ
عبداللہ خان فیروز جنگ کہ ناظم صوبہ دہلی و اہتمام تاسیس عمارت مذکور با و مفوض
شدہ مطابق طرحے کہ در پیش گاہِ خلافت مقرر گشتہ بود ....."

---

[1] اس مطبوعہ نسخہ میں جس کی تصحیح ناظم آثار قدیمہ سرکار نظام مولوی غلام یزدانی صاحب نے کی ہے یہ
سنہ لفظوں میں چہل و ہشت کے بجائے "ہشتاد و چہل" چھپ گیا ہے جو قابل تصحیح ہے [2] اسی طرح یہ بھی
تعجب انگیز ہے کہ اس مطبوعہ نسخہ میں حامد کا نام حذف ہو گیا ہے۔ متعدد قلمی نسخے دیکھے سب میں احمد کے
ساتھ حامد کا نام بھی ہے۔ کتب خانہ حبیب گنج کے نسخہ $\frac{۲۲}{۲۷}$ کی عبارت یہ ہے "موافق ۱۰۴۸ھ در زمانِ
محمود آوانِ مسعود استادِ احمد و حامد سر آمد معمارانِ نادرہ کار ... مطابق طرحے تازہ و نقشے بدیع و منقا ۲

شاہجہانی و عالمگیری عہد کے امرا کے خطوط کا ایک ناقص اور بے نام و نشان پرانا مجموعہ[1] ہے۔ اس کے ایک خط میں نواب جعفر خان کو سرائے باغ اور قلعہ حسن ابدال کی تعمیر کے متعلق کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں استاد احمد معمار کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے :۔

"..... بدرگاہ سلاطین سجدہ گاہ معروض داشتہ حقیقت حسن سلوک و کاردانی محمد مومن مذکور و استاد احمد معمار کہ در طراحی و وقوف کار عمارت و معاملہ شناسی استعداد تمام و دستی بکمال دارد"

عمدۃ الملک نواب جعفر خان مختلف مناصب جلیلہ کے بعد ۱۹ سنہ جلوس شاہجہانی مطابق ۱۰۵۵ھ میں پنجاب کا صوبہ دار، ۲۱ سنہ جلوس شاہجہانی مطابق ۱۰۵۷ھ میں شاہجہان کا وزیر اور ۱۰۷۴ھ میں عالمگیر کا وزیر ہوا اور ۱۰۸۱ھ میں وفات پائی۔ یہ خط غالباً پنجاب کی صوبہ داری یا وزارت کے عہد میں اس کو لکھا گیا ہوگا۔ کیونکہ جیسا آگے معلوم ہوگا کہ اس کے دو ہی برس بعد ۱۰۵۹ھ میں احمد وفات پا چکا تھا۔

سر سید مرحوم نے اپنی قابل قدر تصنیف آثار الصنادید میں استاد احمد اور حامد کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے کہ "یہ اپنے فن میں" بے نظیر اور ہندسہ و ہیئت میں ثانی اقلیدس اور رشک ارشمیدس تھے۔"

بہرحال ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ استاد احمد عہد شاہجہانی میں "سرآمد معماران نادر کار" تھا اور اس کو عمارتوں کا نقشہ اور خاکہ بنانے اور تعمیرات کے دوسرے کاموں میں کمال دستگاہ حاصل تھی۔

---

[1] یہ مجموعہ مولوی عبداللہ صاحب چغتائی (اسلامیہ کالج لاہور) کی ملک میں ہے۔

تاج محل کے حالات میں بعہد انگریزی آگرہ میں ایک فارسی رسالہ خدا جانے کس نے لکھا ہے اس کے قلمی نسخے عموماً ملتے ہیں۔ اس میں حالات کے ساتھ ساتھ عمارات کی تصویریں بھی ہیں شروع میں ممتاز محل کی وفات کی افسانہ نما کیفیت لکھی گئی ہے اور پھر اس میں تاج محل کی تعمیر کا ایک ایک خرچ اور اس کے ایک ایک پتھر کی قیمت اور اس کے ایک ایک کاریگر کا نام مع تعین تنخواہ لکھے ہیں جو زیادہ تر سُنی سنائی حکایتوں اور فرضی اعداد پر مشتمل معلوم ہوتا ہے۔ اس رسالہ میں کاریگروں میں سب سے پہلا نام "استاد عیسیٰ نادر العصر نقشہ نویس ساکن روم" لکھا ہے۔ اس کتاب کے مختلف نسخے دیکھے اور سب میں ناموں کا کچھ نہ کچھ اختلاف پایا، اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس میں ہندو کاریگروں تک کو ساکن روم و بلخ و قندھار و سمرقند لکھا ہے۔ جامعہ علی گڑھ حیدرآباد، بھوپال، ندوہ اور دارالمصنفین کے کتب خانوں کے نسخوں میں اور ان کے علاوہ اور بھی اس کے جو نسخے نظر سے گذرے ان میں بھی یہ فتنہ گری موجود ہے۔ "استاد العصر" تک تو نام صحیح ہے، جو اسی احمد معمار کا شاہی لقب تھا مگر اس میں "عیسیٰ نقشہ نویس ساکن روم" کا نام اضافہ ہے یا یہ کہ "استاد نادر العصر" اور "عیسیٰ ساکن روم" دو نام ہیں جو ایک میں مل گئے ہیں۔ اس کتاب تاج میں امانت خان شیرازی کے سوا جس کا ذکر تاریخوں اور تذکروں کے علاوہ خود تاج کے کتبوں میں ہے جن کاریگروں کی فہرست دی گئی ہے اور جو تنخواہیں لکھی گئی ہیں۔ وہ تمام تر محتاجِ ثبوت ہیں لیکن تعجب ہے کہ تاج کے مورخینِ حال نے ان کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا ہے۔ بہر حال تاج کے معماروں میں سے جو نام اب سب سے زیادہ اہم سند رکھتا ہے۔ وہ یہی نادر العصر استاد احمد ہے جس کا نام اس مضمون میں سب سے پہلی دفعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

لطف اللہ کے بیان سے اس کے باپ احمد کے کچھ اور بھی حالات معلوم ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ احمد معمار تاج محل کا کوئی اناڑی راج نہ تھا۔ بلکہ وہ باقاعدہ ہندسہ (انجینئرنگ) ہیئت

اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا۔ یونانی ریاضیاتِ فلکی کی سب سے اونچی کتاب مجسطی کا ماہر تھا اور اقلیدس میں خواجہ نصیر طوسی کی مشہور کتاب تحریر اقلیدس کا عالم تھا۔ لطف اللہ ایک مثنوی میں اپنے خاندانی حالات کا ذکر ان لفظوں میں کرتا ہے:

شاہجہان داور گیتی ستاں — روشنی دودۂ صاحب قراں
عرشِ بریں قبۂ خرگاہِ اوست — رشکِ فلک سدۂ درگاہِ اوست
احمد معمار کہ در فنِ خویش — صد قدم از اہلِ ہنر بود بیش
واقفِ تحریر و مقالاتِ آں — آگہ اشکال و حوالاتِ آں
حال کواکب شدہ معلوم او — سرِ مجسطی شدہ مفہوم او
از طرفِ داورِ گردوں جناب — نادرِ عصر آمدہ اورا خطاب
بود عمارت گر آں بادشاہ — داشت دراں حضرتِ فرخندہ راہ

ان اشعار سے نادر العصر احمد معمار شاہجہانی کے فضل و کمال کا پورا اظہار ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہجہان کا مشہور عمارت گر تھا۔ اب اس کے بعد وہ اشعار آتے ہیں جن میں اس عظیم الشان حقیقت کا انکشاف ہے جو اب تک مستور و مخفی تھی، یعنی یہ کہ یہی وہ جملہ ہستی ہے جس نے ممتاز محل کا روضہ اور دہلی کا لال قلعہ تعمیر کیا، کہتا ہے۔

آگہ چو شد مضربِ رایاتِ شاہ — بس کہ برو بود عنایاتِ شاہ
کرد بحکمِ شہِ کشور کشا — روضۂ ممتاز محل را بنا
باز بحکمِ شہِ انجم سپاہ — شاہجہان داورِ گیتی پناہ
قلعۂ دہلی کہ ندارد نظیر — کرد بنا احمدِ روشن ضمیر

ان دو کے علاوہ عہدِ شاہجہانی کی دوسری عمارتیں بھی اس نے بنائی تھیں چنانچہ کہتا ہے:

این دو عمارت کہ بیاں کردہ ام — در صفتش خامہ رواں کردہ ام
یک ہنر از گنج ہنرہائے اوست — یک گہر از کانِ گہرہائے اوست

اس کے بعد اس کی وفات کا ذکر کیا ہے،

چوں نبود عالمِ فانی معتبر — کرد سوئے عالمِ باقی سفر

اس مثنوی کے شروع میں شاہجہان کا ذکر زمانۂ موجودہ میں کیا گیا ہے؛

عرشِ بریں قبۂ خرگاہِ اوست — رشکِ فلک سدۂ درگاہِ اوست

اس سے ظاہر ہے کہ یہ مثنوی شاہجہان کی زندگی میں لکھی گئی ہے اور اسی کے عہد میں تاج محل اور قلعۂ دہلی کی تعمیر کا یہ دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ ثبوت اور کیا درکار ہے۔

استاد حامد استاد احمد کے ساتھ اس کے بھائی استاد حامد کا نام بھی ذکر کے قابل ہے۔ یہ معماری، ہندسہ اور دیگر علوم ریاضی میں سر برآوردہ تھا اور قلعہ کی تعمیر میں احمد کا شریک تھا۔ سرسید مرحوم اپنی قابل قدر کتاب آثار الصنادید میں قلعۂ شاہجہانی کے بیان میں لکھتے ہیں کہ:

"اچھی سے اچھی ساعت دیکھ کر استاد حامد اور استاد احمد معماروں نے کہ اپنے فن میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اور ہندسہ و ہیئت میں ثانی اقلیدس اور رشک از میدس تھے۔ اس قلعہ کی بنا ڈالی۔" (طبع اول ص۳ باب دوم)

طبع دوم میں بھی عبارت ان لفظوں میں ہے۔

"استاد حامد اور استاد احمد جو اپنے فن میں یکتا تھے۔ اس قلعہ کو بنواتے تھے"

(طبع دوم نامی پریس ص۳)

دہلی کے بڑے بوڑھوں کی زبانی یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے کہ جامع مسجد دہلی بھی اسی

استاد حامد نے جس کا مشہور نام "استا حامد" ہے۔ بنائی ہے اور اس کے بنانے میں اس کا دوسرا شریک "استا ہیرا" تھا۔

استاد حامد کا نام قلعۂ دہلی کے بعد جو ۱۰۴۸ھ میں بنا، مانڈو کے ایک سیاحتی کتبہ میں جس کی تاریخ ۱۰۵۹ھ ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا لکھا ہوا ملتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس زمانہ تک زندہ تھا۔ دہلی کے ایک قدیم معزز خاندان کے ایک واقف کار (سید مرتضیٰ صاحب ہیڈ کلرک دفتر کمانڈر ان چیف دہلی) کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ استاد حامد اور استاد احمد دونوں بھائی تھے۔ استاد حامد کے نام سے "کوچہ اوستا حامد" دہلی میں اب تک دریبہ اور جامع مسجد کے درمیان موجود ہے اور ان کی اولاد دہلی میں سکونت پذیر ہے اور لاہور والے کہلاتے ہیں اور آج کل ؎ سادہ کاری کا کام کرتے ہیں۔ الغرض یہی وہ دو کاریگر ہیں جنہوں نے قلعۂ معلی اور اس کے حیرت انگیز عمارات دیوانِ عام، دیوانِ خاص، غسلخانہ اور دوسرے محلاتِ شاہی بنائے۔ اس تعمیر میں ایک تیسرا نام احمد کے بیٹے لطف اللہ کا شامل ہے جس کا ذکر آگے آئیگا

استاد احمد کی تاریخ وفات

اس دیوان کے آخر میں استاد احمد معمار کی وفات کی دو تاریخیں بھی درج ہیں:۔

(۱)

درزمانِ سعیدِ شاہجہان — شاہِ عالم پناہ جم مقدار
نادرالعصر رفت و گفت خرد — شد بفردوس احمدِ معمار

(۲)

آں نادرِ عصر زینتِ دہر — چوں رفت بسوئی ملک سرمد

لہ وال کے بغیر استا حامد

تاریخِ وفاتِ او خرد گفت　　محمود العاقبت شد احمد

ان دونوں قطعوں کے ہر چوتھے مصرع سے ۱۰۵۹ھ کے اعداد نکلتے ہیں۔ روضہ کی تعمیر ۱۰۵۰ھ میں یعنی احمد کی وفات سے نو برس پیشتر ختم ہو چکی تھی اور دہلی کا لال قلعہ ۱۰۴۸ھ سے شروع ہو کر احمد کی وفات سے ایک سال پہلے ۱۰۵۸ھ میں تکمیل پایا تھا۔ ممکن ہے کہ استاد احمد روضہ کو ختم کر کے قلعہ کی تعمیر میں شامل ہوا ہو یا روضہ کا اصلی تعمیری کام ختم کر کے شروع ہی سے قلعہ کی تعمیر میں مصروف ہوا ہو۔

استاد احمد نے ان تعمیری یادگاروں کے علاوہ اپنی تین جسمانی یادگاریں بھی چھوڑیں اور ان کو بھی تعمیر و ہندسہ و ریاضیات کی بہترین تعلیم دی اور غالباً اس کے پیش نظر یہ چیز تھی کہ ریاضیات کی اعلےٰ درجہ کی جو کتابیں اب تک صرف عربی زبان میں ہیں۔ ان کو فارسی میں منتقل کیا جائے تاکہ وہ علوم فارسی دانوں کی دسترس میں آسکیں۔ چنانچہ ۱۰۵۰ھ میں یعنی جس سال روضہ تمام ہوا ہے اور قلعہ دہلی کی تعمیر جاری تھی۔ اس نے اپنے منجھلے بیٹے لطف اللہ کو عبدالرحمان صوفی کی صور الکواکب کے ترجمہ کا حکم دیا۔

احمد معمار کی تین اولادیں

لطف اللہ کی جس مثنوی کے کچھ ابتدائی اشعار اوپر نقل کیے گئے ہیں۔ اس میں احمد معمار کی وفات کے ذکر کے بعد اس کے ان تین باکمال فرزندوں کے نام لیے گئے ہیں۔

بس سہ پسر ماند زمرد سترگ　　زاں سہ عطاء اللہ رشیدی بزرگ

دیوان کے اس نسخہ میں رشیدی کی جگہ کاتب نے "رشید" لکھا ہے مگر اس کی تصنیفات میں اس کے نام کے ساتھ "رشیدی" لکھا ملتا ہے اور جیسا کہ ظاہر ہے کہ اسی لفظ کو اسی طرح پڑھنے سے شعر صحیح ہو سکتا ہے۔ پھر عطاء اللہ کی تعریف میں کہتا ہے،

نادرِ عصرِ خود و مشہورِ شہر   عالم و علامہ و دانائے دہر
مردِ ہنر پرور و استادِ فن   فاضل و دانشور و حبرِ زمن
مخزنِ علم آمدہ تالیفِ او   گنجِ ہنرہاست تصانیفِ او
نثروی از آبِ رواں پاک تر   نظمِ خوشش غیرتِ سلکِ گہر

اس آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عطاء اللہ شاعر بھی تھا اور غالباً اس کے نام کے بعد "رشیدی" اس کا تخلص ہے۔ اس کے بعد شاعر یہ بیان کرتا ہے کہ اس نے تمام تر اپنے اسی بڑے بھائی سے تعلیم پائی ہے

منکہ سخن پرور و دانش ورم   بندۂ آں حبرِ سخن پرورم
منکہ ربودم زجہان گوئے علم   از حمیتش یافتہ ام بوئے علم
منکہ شدم آگہِ سرِ نہاں   از دمِ او یافتہ ام قوتِ جاں

اس کے بعد لطف اللہ اپنے کو احمد معمار کا منجھلا بیٹا بتاتا ہے، اور اپنی تعریف آپ کرتا ہے

ثانیِ آں ہر سہ برادر منم   ہندسہ یک فن بود از صد فنم
گرچہ مہندس لقبم از شہ است   نام من دل شدہ لطف اللہ است

لطف اللہ اپنا نام اور مہندس شاہی خطاب بتاتا ہے اور یہی اس کا تخلص بھی ہے۔ اس کے بعد اپنے سب سے چھوٹے بھائی نور اللہ کا نام لیتا ہے۔

ثالثِ آں ہر سہ برادر ببال   آمدہ نور اللہ صاحب کمال

پھر کہتا ہے کہ ہم تینوں بھائی معمار اور انجینئر ہیں۔

ما ہمہ معمار و عمارت گریم   ما ہمہ استاد و سخن پروریم

اس کے بعد اپنے چھوٹے بھائی نور اللہ کی نظم و نثر کی تعریف کرتا ہے اور تعمیر

فن کی بنا پر معمار کا موروثی لقب اسی کے لئے مخصوص کرتا ہے۔

لیک بود قصرِ کلامش عجب	زاں شدہ معمار مرا او را لقب
گرچہ کلم است سالِ بلے ز سالِ من	بیش بود حالِ وے از حالِ من
نثرِ وے از نظمِ گہر بار تر	نظم ز نثر آمدہ ہموار تر
دیدہ ز نورِ سخنش پر ضیا	طبع ز لطفِ سخنش پر صفا
گنجِ ہنر آمدہ در مشتِ او	ہفت قلم راندہ سہ انگشت او
گرچہ منم بے سخن استادِ فن	آں یک وے ایں یک بود استادِ من

اسی آخری شعر کا مطلب شاید یہ ہے کہ میں سب سے چھوٹے بھائی کا استاد ہوں اور بڑا بھائی میرا استاد ہے۔ اس مثنوی کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے۔

گرچہ مرا ہست مہندس لقب	ہندسہ زاں ہر سہ برادر طلب

اس سے ثابت ہوا کہ ہندسہ اور عمارت گری کے فن میں یہ تینوں بھائی مہارت رکھتے تھے
الغرض احمد معمار کے ان تین باکمال بیٹوں کے نام بہ ترتیب یہ ہیں :-

۱۔ عطاء اللہ رشیدی نادر العصر
۲۔ لطف اللہ مہندس
۳۔ نور اللہ معمار

ابھی حال میں (جولائی ۱۹۳۵ء میں) لطف اللہ کی ایک اور تصنیف سحر حلال کا پتہ چلا۔ یہ مختصر رسالہ مدرسہ محمدی مدراس کے کتب خانہ میں ہے۔ جس کا نمبر ۲۸۰۶ ہے۔ اس کا دوسرا نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے۔

اس رسالہ میں بھی لطف اللہ نے اپنے باپ اور اس کے تینوں بیٹوں کا حسب ذیل

عبارت میں جو بصورت معمہ ہے تذکرہ کیا ہے۔

"احمد معمار والد مملوک وا وا رسہ ولد دارد، اول عطاءاللہ سلمہ اللہ سالک مسالک علم..... عالم و عامل و علامہ عصر..... رسالہا در علم اعداد مسطور کردہ..... وولد دوم اوسط ہر سہ مملوک درگاہِ کردگار و اسم مملوک حامل دو کلمہ آمد کلمہ دوم اللہ..... وکلمۂ اول لام و طا و معاول عدد عطا، وولد سوم در مسالک علم و مسال..... و اسم و ہم دو کلمہ دارد، کلمۂ دوم اللہ..... وکلمۂ اوّل معاول مطا ور....."

احمد معمار کے بڑے بیٹے کا نام عطاء اللہ تو صاف ہے، منجھلے بیٹے کے جو مصنف کتاب ہے۔ نام کا دوسرا جزء اللہ اور پہلا جزء لام اور طا اور ایک ایسا حرف ہے جس کا عدد لفظ "عطا" کے برابر ہے یعنی ۸۰ جو حرف ف کا عدد ہے۔ یہ سب مل کر "لطف اللہ" ہوتا ہے۔

چھوٹے لڑکے کے نام کا بھی دوسرا جزء "اللہ" اور پہلا جزء "مطا" کا مساوی العدد اور ذ ہے۔ مطا کا عدد ۵۰ ہے جو حرف ن کا معاول ہے۔ حرف ن کو واؤ اور ر سے ملانے سے پورا نام "نور اللہ" نکلتا ہے

ان تینوں باکمالوں کے نام مختلف عمارتوں کے کتبوں کے گوشوں میں لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ لیکن اگر دیوان مہندس کا یہ نسخہ ہاتھ نہ آتا تو اس خاندان کے ان مختلف افراد کے یہ باہمی تعلق کا واقعہ دنیا سے پوشیدہ رہتا۔

نور اللہ معمار یہ استاد احمد کا سب سے چھوٹا لڑکا، اور لطف اللہ مہندس کا سب سے چھوٹا بھائی ہے۔ اس کی کوئی تصنیف اب تک نہیں ہے مگر مہندس کے بیان سے یہ ثابت ہے کہ وہ بھی معماری کے فن میں امتیاز رکھتا ہے

لیک بو تقصیر کلامش عجب　　زاں شدہ معمار مراد لقب

سب بھائیوں میں سے معمار کا موروثی لقب اسی کو حاصل تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے وقت کا بہت بڑا خطاط تھا۔ اسی لئے مہندس نے اس کی نسبت کہا ہے۔

گنجِ ہنر آمدہ در مشتِ او　　ہفت قلم راندہ سر انگشتِ او

یعنی وہ خط کے ساتوں قلموں میں ماہر تھا۔ مہندس کے بیان کی شہادت آج بھی دنیا میں موجود ہے۔ دلّی کی شاہجہانی جامع مسجد میں بیرونی محرابوں کی اوپر کی دیوار میں مسجد کے بنائے جانے کی جو تاریخ طویل فارسی نثر عبارت میں بخط نسخ تحریر ہے۔ وہ اسی باکمال کی انگلیوں کا معجزہ ہے۔ چنانچہ کتبہ کے آخر میں سمت شمال ایک گوشہ میں کتبہ نورا للہ احمد لکھا ہوا ہے۔

عطاء اللہ رشیدی

عطا اللہ رشیدی احمد معمار کا سب سے بڑا لڑکا، اور لطف اللہ مہندس یعنی احمد کے منجھلے بیٹے کا استاد ہے۔ مہندس کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بہت سی کتابوں کا مصنف بھی تھا کہتا ہے۔

مخزنِ علم آمدہ تالیفِ او　　گنجِ ہنر ہاست تصانیفِ او

سحرِ حلال میں بھی اس کے متعلق حسب ذیل الفاظ ہیں،

"سالک مسالک علم عالم و عامل و علامۂ عصر رسالہ در علم اعداد مسطور کردہ"۔

اس کی ان متعدد تصنیفات میں سے ہم کو تین کا علم اعداد یعنی حساب ہی میں ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام بیج گنت اور دوسرے کا نام خلاصۂ راز ہے۔ بیج گنت سنسکرت کا لفظ بجا گیتا ہے جس کے معنی علم جبر و مقابلہ کے ہیں۔ یہ سنسکرت میں بھاسکر چاریا کی تصنیف

ہے۔ عطاء اللہ نے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا۔ اس کے نسخے برٹش میوزیم، میونک یونیورسٹی اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کی لائبریریوں اور کتب خانۂ سعیدیہ حیدرآباد میں ہیں۔ اس میں مصنف اپنا نام "عطاء اللہ رشیدی بن احمد نادر" بتاتا ہے، رسالہ کا آغاز اس شعر سے ہے

اوّل زستایشِ الٰہی گوئیم پس نعتِ رسول او کماہی گوئیم

یہ شعر میرے خیال میں فیضیؔ کے جواب میں ہے فیضیؔ نے سنسکرت کی حساب کی مشہور کتاب لیلاوتی کا جو ترجمہ اکبر کے زمانہ میں کیا ہے۔ اس کے آغاز میں یہ شعر لکھا ہے جو سراسر خوشامد ہے

اوّل زثنائے بادشاہی گوییم وانگہ زستائشِ الٰہی گوییم

رشیدیؔ گویا اس کے جواب میں کہتا ہے:

اوّل زستائش الٰہی گوییم پس نعت رسول او کماہی گوییم

ندوۃ العلماء لکھنؤ اور کتب خانۂ سعیدیہ حیدرآباد کے نسخے میری نظر سے گذرے ہیں دیباچہ میں ہے:-

"اما بعد می گوید بندۂ محتاج بخداوند قادر عطاء اللہ رشیدی ابن احمد نادر کہ بہ توفیق الٰہی در سنہ اربع و اربعین والف ہجری ۱۰۴۴ھ مطابق ہشتم سال جلوس حضرت صاحب قرآنی برا ورنگ سلطنت و جہانبانی کتاب جبر و مقابلہ ہندوی موسوم بہ بیج گنت تصنیف بھاسکر اچارج صاحب لیلاوتی راکہ در علم حساب کشافی است بحقائق رائقہ و مفتاحے است بدقائق فائقہ و محتویست بر فوائد بلند و مطالب ارجمند، کہ در لیلاوتی مذکور نیست، و در ہیچ نسخہ فارسی و عربی مسطور نہ، از زبانِ ہندی بفارسی آوردم، و دیباچہ کتاب را بکتابہ دعائے دولت حضرت خاقانی، وارث ملک سلیمانی، مرتقیِ مدارج عزّ و جلال ..... ابوالمظفر

شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی، شاہجہان نامی بادشاہ غازی . . . . "

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب جو لیلاوتی کے مصنف بھاسکراچاریہ کی دوسری کتاب کا ترجمہ ہے، شاہجہان کے آٹھویں سال جلوس ۱۰۴۴ھ میں مکمل ہوئی ہے۔ سعیدیہ کا نسخہ محمد شاہ کے زمانہ میں ۱۱۴۵ھ میں منقول ہوا ہے۔ ندوہ کے نسخہ کا نمبر کتب خانہ میں نمبر ۶۵ ریاضی ہے۔

برٹش میوزیم اور میونک یونیورسٹی کی لائبریریوں کی فہرستوں میں اس نسخہ کا مختصر حال درج ہے۔ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں بدر الحساب کے نام سے بیج گنت کا ایک ترجمہ موجود ہے جو ۱۰۷۵ھ میں برہان پور میں کیا گیا ہے۔

عطاء اللہ رشیدی کی دوسری کتاب خلاصہ راز کا نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں ہے۔ اس میں اس نے اپنا نام یہ لکھا ہے "عطاء اللہ بن استاد احمد معمار" اس کا آغاز اس شعر سے ہے۔

شکر بے حد بواحد ازلی   حمد بے حد بفرد لم یزلی

رسالہ کا موضوع حساب، مساحت اور جبر و مقابلہ ہے۔ زبان فارسی نثر ہے اور رسالہ کی تقسیم دس بابوں پر ہے۔ رسالہ کے دیباچہ میں شاہجہان بادشاہ اور شاہزادہ داراشکوہ کی ستائش ہے، اور رسالہ شاہزادہ کے نام سے معنون ہے۔ داراشکوہ ۱۰۶۷ھ میں قتل ہوا ہے۔ اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ رسالہ اس سے پہلے تالیف پا چکا تھا۔

اس کی تیسری کتاب خزینۃ الاعداد ہے جو علم حساب، الجبرا اور عملی اقلیدس میں ہے۔ مقدمہ میں اس نے بیان کیا ہے کہ اس نے یہ کتاب مبتدیوں اور سرکاری مالی دفتروں کے ملازموں، تاجروں اور مذہبی عالموں کے لئے لکھی ہے۔ اس رسالہ کا آغاز ان الفاظ

سے ہوا ہے :-

"الحمد للّٰہ الذی جعل الشمس ضیاء و القمر نوراً قادر منازل .. .

مؤلف ایں رسالہ و مترجم ایں مقالہ المفتقر الی رحمۃ اللہ الفقیر الحقیر عطاء اللہ"

رسالہ میں ایک مقدمہ، دو مفتاح، دس باب ایک کشکول اور ایک خاتمہ ہے۔ کتاب کا نام (خزینۃ) تاریخی ہے جس سے ۱۰۶۲ھ نکلتا ہے۔ جیسا کہ اس شعر سے معلوم ہوتا ہے

زتاریخ اتمامش آگہ شوی چوں نام وے آری تو اندر حساب[1]

یہ نادر نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے جس کا نمبر ۲۰۱ ہے۔

عطاء اللہ رشیدی جیسا کہ اس کے بھائی لطف اللہ نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے، شاعر بھی تھا اور رشیدی تخلص کرتا تھا مگر اس کا کوئی شعر ہم تک نہیں پہنچا ہے۔ بجز اس کے کہ لطف اللہ کے ہاتھ کی ایک کتاب صورِ صوفی کا جو اصل نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ اس کے آخر میں ایک صفحہ پر عطاء اللہ کے قلم کی ایک مشق ہے جس میں آفتاب اور سہا کے تناسب کچھ فقرے لکھے ہیں اور آخر میں یہ شعر درج ہے۔

عطاء اللہ کہ گرنامش نہی ہیچ زغیرت ہیچ افتد درخم و پیچ

---

[1] فہرست کتب عربی و فارسی و اردو کتب خانۂ جامعۂ بمبئی مرتبہ شیخ عبدالقادر، فاضل مرتب نے عطاء اللہ بن احمد کو اس رسالہ کا مصنف ظاہر کرنے کے باوجود اس کا سال تصنیف "خزینۃ الاعداد" کے دونوں جزوں کے اعداد کو گنکر ۱۱۷۰ھ ظاہر کیا ہے جو ظاہر ہے کہ صحیح نہیں۔ کیونکہ یہ تاریخ مصنف کی زندگی کے بہت بعد ہے لیکن اگر نام کے دونوں جزوں کے اعداد لئے جائیں اور ۱۰۶۲ھ صحیح ہو تو پھر یہ کسی دوسرے عطاء اللہ کا رسالہ سمجھا جائے گا۔

عطاء اللہ کے یہ تو علمی کارنامے ہیں لیکن اس کا ایک عملی کارنامہ بھی دنیا میں موجود ہے
ر وُہ شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کی محبوب بیوی ملکہ دورانی کا مقبرہ ہے جو اورنگ آباد
ن میں واقع ہے۔ یہ مقبرہ تمامتہ روضۂ تاج محل کی نقل ہے خیال ہوتا ہے کہ چونکہ اس کے
پ احمد معمار نے تاج کا روضہ بنایا تھا۔ اس لئے قرین قیاس سمجھا گیا کہ اس کا خلف الرشید
نقش اول کا بہترین نقشِ ثانی تیار کر سکتا ہے مگر ظاہر ہے کہ آگرہ میں جو سامانِ تعمیر
ا ہو ان کے عہد میں مہیا ہو سکتا تھا۔ وُہ اورنگ آباد دکن میں عالمگیر کے عہد میں میسر
یں آسکتا تھا۔ پتھر اور اینٹ کے فرق کے علاوہ جو نزاکت، لطافت، ورتناسب روضہ
خصوصیات ہیں۔ ان کی نقل اتاری نہ جا سکی۔

" رابعہ دورانی کے مقبرہ کے صدر دروازہ پر پیتل کا پتر چڑھا ہوا ہے۔ اس پر ایک
ت یہ عبارت لکھی ہے۔

" ایں روضۂ منورہ در معماری عطاء اللہ معمار و ہیبت رائے طیار شدہ ۱۰۶۱"

(٢)

لطف اللہ مہندس

احمد معمار کے دوسرے بیٹے لطف اللہ مہندس کی اس وقت متعدد یادگاریں دنیا میں باقی ہیں اور کہنا چاہئے کہ یہی وہ سپوت ہے جس کے ذریعہ اس کے باپ کا نام دنیا کو معلوم ہو سکا۔ سندیلوی نے اپنے تذکرۂ مخزن الغرائب میں جو ۱۲۱۸ھ کی تصنیف ہے۔ مہندس کے بیٹے امام الدین ریاضی کے تحت میں مہندس کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے۔

"مولوی لطف اللہ مہندس بودہ است۔ ایشاں ہم بگفتن اشعار میل تمام داشتند و مہندس تخلص می کردند و در علم ریاضی مثل ایں ہر دو پدر و پسر در بلادِ ہند نبودند (نسخہ قلمی دار المصنفین صد ۱۵۳) اور سفینۂ خوشگو میں ہے۔

"خلف ملا لطف اللہ مہندس تخلص لاہوریست کہ قلعۂ ارک دار الخلافہ شاہجہان آباد بتجویز و صوابدید او بنا یافتہ"

یہی نفسِ حسین قلی خان کے "نشترِ عشق" میں ہے۔ اس کی سات تصنیفات کے نام ہم کو معلوم ہو سکے ہیں۔ جن کے نسخے اس وقت ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ لیکن ان تصانیف کے علاوہ اس کی عجیب و غریب یادگار اس کا ایک آہنی کتبہ ہے جو سلاطینِ مالوہ کے پایہ تخت مانڈو میں وہاں کے مشہور بادشاہ ہوشنگ غوری (۸۰۸ھ ۔ ۸۳۸ھ) کے مقبرہ کے دروازہ کے داہنے ہاتھ پر لگا ہوا ہے۔ یہ ۸ انچ لمبا اور ۱/۲ ۴ انچ چوڑا کتبہ ہے جس میں بخط جلی حسب ذیل عبارت چار سطروں میں منقوش ہے

۱۔ بتاریخ نہم ربیع الثانی سنہ ہزار و ہفتاد ہجری،
۲۔ فقیر حقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار شاہجہانی،
۳۔ و خواجہ جادو رائے و استاد شیو رام و استاد حامد،
۴۔ بجہت زیارت آمدہ بود،

اثریات ہند کے ماہر جناب ظفر حسن صاحب بی اے (محکمہ آثار قدیمہ ہند) نے مانڈو کے کتبات پر انگریزی میں جو مقالہ لکھا ہے۔ اس میں یہ کتبہ سترھویں پلیٹ پر چھاپ دیا ہے اور وہ اس وقت میرے سامنے ہے۔

غالباً ان معمار سیاحوں کے لئے اس کتبہ کے یہاں لگنے کا محرک یہ امر ہوا ہے۔ کہ یہاں اکبر بادشاہ نے اپنے سفر و گذر کی تاریخیں ثبت کرائی ہیں۔ انہیں کو دیکھ کر ان معماروں نے بھی اپنا یادگاری کتبہ لگا دیا ہے۔

اس کتبہ سے متعدد باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ اس عہد کے استادانِ فنِ تعمیر دوسری عمارتوں کو بھی فن کی حیثیت سے دیکھنے کے لئے جایا کرتے تھے۔

۲۔ ہندو مسلمان باکمالوں میں فن کی یکجہتی کا رشتہ خاصہ مستحکم اور مضبوط تھا۔

۳۔ ہندو شاہی معماروں کے ناموں کے ساتھ خواجہ اور استاد کا بولنا کیسا عام تھا جو
جادو رائے اور استاد شبو رام کبھی کیسی عزت کے الفاظ تھے۔

۴۔ لطف اللہ مہندس گو شاعر و مصنّف تھا۔ تاہم اس میں اس کے موروثی فن تعمیر
کا ذوق اتنا تھا کہ وہ دوسرے معماروں کے ساتھ کسی عمارت کے دیکھنے کے لئے سفر
کی زحمت گوارا کر سکتا تھا۔

لطف اللہ کی جن سات کتابوں کے نام ہم کو ملے ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ صور صوفی،

۲۔ رسالہ خواصِ اعداد

۳۔ شرح خلاصۃ الحساب،

۴۔ منتخب الحساب،

۵۔ تذکرۂ آسمانِ سخن،

۶۔ دیوان مہندس،

۷۔ سحرِ حلال،

پہلی کتاب ہیئت میں اور بعد کے تین رسالے علم حساب میں ہیں اور دوسری کو چھوڑ کر
کہ وہ عربی میں ہے۔ بقیہ چھ کی زبان فارسی ہے جن میں سے تین اول الذکر اور آخری
میں ہیں اور چوتھی اور پانچویں دو کتابیں نظم ہیں۔ اب ذیل میں ہم ہر ایک تصنیف پر مختصر
تبصرہ کرتے ہیں۔

۱۔ صورِ صوفی۔ مشہور مسلمان ہیئت دان عبدالرحمٰن الصوفی المتوفی سنہ ۳۷۶ھ نے

ستاروں کے اشکال و صُور پر جو بلند پایہ تصنیف صُور الکواکب کے نام سے لکھی تھی، لطف اللہ نے سنہ ۱۰۵۰ھ میں اپنے باپ احمد معمار کے حکم سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کی عمر کا پہلا کام ہے کہ اس کا دیباچہ کسی بادشاہ کے نام کے بجائے خود اس کے باپ کے نام نامی سے مزین ہے اور اس میں یہ نوجوان مصنف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی محنت کا بہترین صلہ یہ ہے کہ اس کا باپ اس کے اس کام کو دیکھ کر خوش ہو۔ اس کتاب کا اصل مسودہ جو خود لطف اللہ کے ہاتھ کا لکھا ہے مسلم یونیورسٹی لائبریری (نمبر ۱۳۱ فارسی علوم) میں موجود ہے دیباچہ کی عبارت یہ ہے:

"درخشندہ ترین کواکبی کہ از مشرق طبع بر فلکِ ظہور آمد حمد مبدعی و شکر مخترعی . . . .

اما بعد چنین گوید محتاج الی اللہ القادر الغفار، لطف اللہ بن احمد النادر المعمار، مد اللہ ظلہ علی روس الاولاد بحرمتہ النبی و آلہ الامجاد کہ چوں اشارۂ آنحضرت بسوئے ایں فقیر حقیر شد کہ کتابِ عمدۃ الاسلام قدوۃ الانام مولانا عبدالرحمٰن ابن صوفی افاض اللہ علیہ شآبیب الغفران و اسکنہ فرادیس الجنان، کہ در معرفت نجوم ثابتہ کتابیست معتبر، و رسالہ ایست کافیہ بجہتِ عمومِ فائدۂ کلام، و سہولتِ فہمِ مرام، بعبارت فارسی سادہ ترجمہ کردہ آید، بر ترغیبِ خاطرِ فارسی خوانانِ حقیقت طلب باعث تر شود، کمرِ اطاعت بر میانِ جان بستہ، دست را بنوشتن نگارین کرد، امید کہ با این بحیۂ مرضیہ من در عقبیٰ ماجور، و ترجمہ من در دُنیا مقبول باشد، و طالبانِ این فن از بن ترجمہ مستفید شوند، چنانکہ از اصل این، و اگر خطائے باشد اصلاح فرمایند الحمدللہ و المنۃ کہ در فرصتے اندک ہمگی بوجہ احسن و شائستہ میسر شد، و سنہ یک ہزار و پنجاہ ہجری اتمام پذیرفت، اما حسن و شائستہ نزد قتی کہ از نظرِ مبارکِ والد

بزرگوار من بگذرد، و بعینِ عنایت و چشمِ کرمت نگاہ کن۔ و قبول فرمایند۔"

خاتمہ کی عبارت :۔

". . . ہزار در ہزار حمد ایزد دادار کہ ترجمۂ کتاب صور صوفی حسب الحکم قبلۂ صورت و معنی کعبۂ ظاہر و باطن، خداوند حقیقت و مجاز، ابو یم المسمی با حمد المخاطب بنادر العصر سلمہ اللہ تعالیٰ من بلیات الزمان و آفات الدہر بآخر رسید و اتمام پذیرفت"۔

"بقلم شکستہ رقم لطف اللہ کہ مؤلف ایں رسالہ و مترجم ایں مقالہ است کتاب باتمام رسید الحمد للہ علی نعمائہ والصلوٰۃ علی انبیائہ لاسیما علی محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین واغفرلی ولوالدی بحرمتہم یا ارحم الراحمین"

کتاب کے آخری صفحہ پر آفتاب اور سہا کی مناسبت سے کچھ فقرے مشق کئے گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی یادگار کے طور پر اس گھر کے ارکان نے محفوظ رکھا تھا۔ یہ مشق میرے خیال میں اس کے بھائی عطاء اللہ کے قلم سے ہے کہ آخر میں ایک شعر میں جو اوپر عطاء اللہ کے حال میں نقل کیا جا چکا ہے۔ اس کا نام لکھا ہے۔

۴۔ رسالہ خواصِ اعداد :۔ یہ فارسی میں علم حساب پر سات صفحوں کا رسالہ ہے اور چار مقالوں پر منقسم ہے۔ اس میں اعداد کے خواص اور خصیتوں پر بحث کی گئی ہے۔ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں ایک مجموعہ کے اندر ہے جس میں دو رسالے لطف اللہ کے ہیں اور تیسرا عطاء اللہ کا وہی خلاصۂ راز ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے (۱۶۷۴۴) اس کا آغاز یہ ہے :۔

"الحمد للہ . . . می گوید فقیر لطف اللہ متخلص بہ مہندس"

اس کا دوسرا نسخہ کتب خانۂ سعیدیہ حیدرآباد دکن میں نظر سے گذرا ہے نسخہ جدید الخط

ہے۔ ۱۰۳۸ھ میں نقل ہوا ہے۔ آغاز یہ ہے۔

"الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین
اما بعد میگوید فقیر لطف اللہ متخلص بہ مہندس ابن استاد احمد لاہوری کہ ایں رسالہ
ایست مختصر در علم ارسماطیقی (ارثماطیقی) یعنی خواص اعداد، بداں اسعدک اللہ
فی الدارین۔"

اس رسالہ کا کوئی خاص نام نہیں معلوم ہوتا۔ کتب خانہ سعیدیہ میں اس کا نام رسالہ ارسماطیقی مندرج ہے اور اسی نام سے یہ رسالہ خاندان دیوان مدراس کے کتب خانہ میں بخط مولوی محمد غوث شرف الملک موجود ہے۔

۳۔ **شرح خلاصۃ الحساب**۔ علم حساب میں بہاء الدین محمد بن حسین آملی المتوفی ۱۰۳۰ھ کی مشہور عربی تصنیف خلاصۃ الحساب کی ممزوج شرح ہے۔ اس کی شرحیں متعدد علماء نے لکھی ہیں۔ جن میں خود اس کے معاصر عصمۃ اللہ سہارنپوری کی عربی شرح جو ۱۰۴۰ھ میں لکھی گئی ہے۔ بہت مشتمل ہے اور چھپ بھی چکی ہے اور جس کا نام انوار خلاصۃ الحساب ہے۔ دوسری یہ لطف اللہ مہندس کی ہے۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے (نمبر ۱۶، مخطوطات عربی) اس میں مصنف کا نام لطف اللہ المتخلص بالمہندس ابن الاستاذ احمد المعمار لکھا ہے اور اس کا آغاز ان لفظوں سے ہے الحمد للہ الواحد الفرد الصمد" یہ نسخہ ایک خاص حیثیت سے ممتاز ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اس کتاب کا دوسرا نسخہ ہندوستان میں رامپور کے کتب خانہ میں ہے۔ (نمبر ۵۴ ریاضی) اس نسخہ کے صفحات کی تعداد ایک سو بیس ہے۔

۴۔ **منتخب**:۔ یہ بہاء الدین آملی کی مذکورۂ بالا تصنیف خلاصۃ الحساب کا فارسی

ترجمہ اور خلاصہ ہے۔ انگلستان اور ہندوستان میں اس کے متعدد نسخے ہیں۔ دو نسخے انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہیں۔ تیسرا برٹش میوزیم لائبریری میں[1] چوتھا کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن میں، پانچواں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں، چھٹا جامعہ ملیہ دہلی میں اور ساتواں کتب خانۂ دیوانِ مدراس میں بخط سید محمد قاسم مکتوبہ ۱۲۱۸ھ ہے۔ اس رسالہ کا "منتخب" نام تاریخی ہے۔ اس سے ۱۰۹۲ھ کی تاریخ نکلتی ہے۔ مقدمہ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب خاندانِ وزارت کے رکن رکین میر محمد سعید بن میر محمد یحییٰ کی فرمائش سے لکھی گئی ہے۔

اس کا آغاز اور دیباچہ حسب ذیل ہے:۔

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

اما بعد می گوید فقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد لاہوری غفر اللہ لہ ولوالدیہ، واحسن الیہما والیہ، کہ کتاب حساب را کہ تصنیف است از محقق نحریر مدقق شیخ بہاء محمد بن حسین عاملی (آملی)، رحمۃ اللہ علیہ مشتمل بر قواعد شریفہ، و فوائد لطیفہ، باشارات خلاصۂ دودمانِ سیادت، منتخب خاندانِ وزارت میر محمد سعید بن میر محمد یحییٰ ادام اللہ اقبالہ وضاعف اجلالہ ترجمہ کردم کہ چوں آں نسخہ خلاصہ نام داشت ایں نسخہ را منتخب نہادم ۔ ۔ ۔ نام تاریخ تالیف ایں رسالہ است و ایں رسالہ بنا بر ترتیب کتاب مرتب است بر مقدمہ و ابواب۔

آخر میں ایک حسابی مسئلہ کا حل نظم میں ہے جس کا خاتمہ ان دو شعروں پر ہے:

---

[1] برٹش میوزیم کے نسخہ کا نمبر ۱۶۷۴۴ اور انڈیا آفس کے نسخہ کا نمبر ۲۲۵۳ اور نمبر ۲۲۵۴ اور صفیہ باب ریاضیات فارسی کا نمبر ۲۱۱ ہے۔

منشی ہستم فقیر لطف اللہ   بہ سخن بس شہیر در افواہ
خاکپائے سخنوران کبار   پیرو است : احمد معمار

[illegible] آصفیہ لائبریری کا نسخہ نمبری ۱۱۵۲ ۲۱ رشعبان ۱۲۵۰ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اور [illegible] بادی نسخہ کی تاریخ ۱۲۴۳ھ ہے اور کتاب نمائش اس کا طالب ریاضیات فارسی [illegible] مسلم یونیورسٹی کا نسخہ سبحان اللہ خان لائبریری میں ہے۔ اس کا نمبر ۵۱۱/۲ ہے اور اس کا نام ترجمہ خلاصۃ الحساب ہے اور کتابت کا سال ۱۲۱۸ھ ہے۔ جامعہ ملیہ کے نسخہ کا نمبر ۶، سلسلہ مخطوطات ہے اور تاریخ سے خالی ہے۔

۵۔ آسمانِ سخن: دولت شاہ سمرقندی کا فارسی شعراء کا تذکرہ جو ۸۹۲ھ میں تالیف پایا ہے۔ باایں ہمہ اغلاط دلچسپ ضرور ہے اور اسی لئے اہل سخن کی محفلوں میں اس کا تذکرہ رہا کیا ہے۔ یہ کتاب فارسی نثر میں ہے اور سات طبقوں پر منقسم ہے۔ اکبر کے زمانے میں فائضی کرمانی نام ایک شاعر نے اس کو نظم کر ڈالا اور سات طبقوں کے بجائے اس کو دس طبقوں میں مکمل کیا۔ لطف اللہ مہندس نے فائضی کے نسخہ میں دو اور طبقوں کا [illegible] کے اس کو ۱۲ طبقوں میں پورا کر دیا اور بارہ برجوں کی مناسبت سے اس کا نام آسمانِ سخن رکھی

تمام واقعات لطف اللہ مہندس نے کتاب کے دیباچہ میں [illegible] کئے ہیں [illegible] کا [illegible] شاہ اودھ کے کتب خانہ میں تھا ....

.... [illegible] اسپرنگر نے [illegible] کی فہرست میں صفحہ ۱۱۶ پر اس کتاب کا ذکر [illegible] کیسی اور کتب [illegible] ان [illegible] نہیں گردش چرخ نے اس آسمانِ سخن کو [illegible] غار میں ملا دیا —

لطف اللہ مہندس کے اس اضافہ میں کل ۵۰۲ بیتیں تھیں۔ ایک ایک بیت میں ایک ایک شاعر کا بیان تھا۔ اس کا پہلا شعر یہ تھا۔

نخست ثنائیِ امیرے کہ آسمانِ سخن   بیافرید محیطِ نہ آسمانِ کہن

فہرست مذکور میں ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کے بارھویں طبقہ کے ۱۲ شعر نقل کئے ہیں ان شعروں میں شاہجہانی شعرا کے نام نظم کئے گئے ہیں۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ لطف اللہ نے دورِ اکبری کے بعد جو دو طبقے بڑھائے تھے۔ ان میں سے پہلے میں جہانگیر کے عہد کے اور دوسرے میں شاہجہان کے زمانہ کے سخنوروں کے نام ہوں گے۔ وہ ۱۲ شعر یہ ہیں:-

وحید و ہر آمانی ایں عنایت خاں   وے بجانِ زمان است شہرۂ دوراں
دگر یگانہ ظفر خان تخلصِ احسن   ز بودہ گوئے سخن از سخنوراں در فن
دگر وحیدِ زمن آشنا عنایت خاں   بود بحرِ سخن آشنا عنایت خاں
دگر وحیدِ زمن شادمانِ غم پرور   بیانِ شادی و غم در کلامِ او مضمر
دگر سخنورِ کشمیر محسن فانی   بقائے نامِ وے از دولتِ سخندانی
مہِ سپہرِ سیادت یگانہ میر عماد   کہ بود در غزل و مدح و مثنوی استاد
لبیبِ عصر محمد حسین آشوب است   سخنوری کہ سخنہاش جملہ مرغوب است
دگر وحیدِ زمان است طالبائے کلیم   کہ شعرِ او یدِ بیضا است نزدِ طبعِ سلیم
دگر فریدِ جہاں قدسی محمد خاں   بعہدِ شاہجہاں گور بودہ از اقراں
الٰہی ہمدانی است در سخن استاد   سخنورے است کہ دادِ سخنوری می داد
لبیب از منہ امی نخواند ہیچ کتاب   ز فیضِ حق شدہ مفتوح بر رخش ہر باب

دگر وحید زمن با قیا ترانہ اد خوش ست ہمچو غزالہائے عاشقانۂ او
فصیح از منہ فنحا کہ چوں غزل میگفت چو عندلیب غزلخواں و ردگہرمی سفت

نویں شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ لطف اللہ نے یہ دادِ سخن عہد شاہجہانی (۱۰۶۸ھ)
کے بعد دی ہے۔

۶۔ دیوان مہندس :۔ یہ پورا دیوان چھوٹی تقطیع کے چھیانوے[۹۶] صفحوں میں ہے۔ سب سے پہلے دیوان کے شروع میں دس صفحوں میں چار قصیدے ہیں۔ پہلا نعت میں ہے۔ دوسرا داراشکوہ کی، اور تیسرا شاید داراشکوہ کے بیٹے سلیمان کی مدح میں ہے اور چوتھا کسی معشوق کا سراپا ہے۔ اس کے بعد نئی بسم اللہ سے غزلیں شروع ہوتی ہیں جو حروفِ تہجی پر مرتب ہیں۔ یہ گیارھویں صفحہ سے شروع ہو کر صفحہ ۸۰ پر تمام ہوتی ہیں۔ پھر نئی بسم اللہ سے وہ مثنوی شروع ہوتی ہے جس میں اس نے اپنے خاندان کا احوال لکھا ہے۔ پھر ایک دو مختصر مثنویاں اور چند قطعے ہیں۔ جن میں سے دو چار قطعے تاریخی ہیں۔ پہلے نعتیہ قصیدہ کی تشبیب بہت پر زور ہے۔

خسروِ مہر چو بنشست بر اورنگِ عمل رستمِ روز در اقلیمِ شب افگند خلل
رومیِ روز برافراختہ رایت بمصاف زنگیِ شب سپر انداخت ہنگامِ جدل
کیمیا ساز نبود است گر این عاملِ زر مسِ شب را بزرِ روز چرا کردہ بدل
زر زافزودہ ۂ شب کاستہ زآنروے کہ مہر کردہ آئینۂ ایام دبالی صیقل
سنگ از تربیتِ مہر شود لعل و کنوں اخگر از تربیتش لعل شود در منقل
وقت آن ہست کہ در قافلہ از جیحوں آب زمزم شود اکنون نمی باب بدل
وقت آنست کہ واعظ چو نہد مجلسِ وعظ صورت شیشہ شود نسخۂ واعظ بہ بغل

اس قصیدہ کے آخر میں شاعر نے اپنا اور اپنے باپ کا نام اور اپنے مشاغل تدریس و تدرس کا ذکر کیا ہے

دلِ دانائے مرا فخر بعلم است و بفضل — جاہل است آنکہ بنازد بحلی و بحلل
باش لطف اللہ احمد چہ کنی فخر بعلم — جہل ازیں علم تو بہتر کہ نیاید بعمل
عمر در درس بسر بردی و در آخر کار — ہیچ حاصل نہ شد از مدرسہ جز بحث و جدل

داراشکوہ کے مدحیہ قصیدہ میں اپنی مدح خود ان شعروں میں کرتا ہے

مہندسم کہ کنم صورتِ فلک تصویر — کشم بروے زمیں گر خطوطِ پرکاری
چناں بلند نہادم اساسِ قصرِ خرد — کہ بر سپہر زنم طعنۂ نگونساری
چناں منیر شود سقفِ عمارتِ من — کہ نور مہ بود نزدِ نورِ او تاری
دمی کہ من بعمارت گری شوم مشغول — ملک مصالح کار آورد بسر باری
بدستیاریِ لطفِ شہِ بلند اقبال — بلند پایہ زمن گشت قدرِ معماری
سپہر مرتبہ داراشکوہِ دریا دل — کہ ہمچو ابر کنش می کند گہرباری
بعہدِ دولتِ تو راجہ ہائے کوہستاں — ز فرقِ خویش نہادہ کلاہِ جباری
بیک نگاہ کہ کردی بسوئے کوہستاں — گرفتہ پستی و بلندیِ کوہ ہمواری

ان اشعار میں جن واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کا پتہ موجودہ تاریخوں میں نہیں چلا۔

لطف اللہ مہندس کے اکثر اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نام و نمود کا حریص اور معماری جیسے پیشہ سے اپنے کو بلند سمجھتا ہے۔ چنانچہ اس قصیدہ میں وہ کہتا ہے:

شہا اگرچہ عمارت گریست پیشۂ من — وگرچہ نیست ضمیرم ازیں ہنر عاری

کنوں کہ ملک علم شد خراب عشق بتاں ‌ ‌ ‌ ‌ تو خود بگو کہ چہ نسبت مرا بمعماری

غزلوں کا عام انداز وہی ہے۔ جو اس عہد کے دوسرے ملا شاعروں کے کلام میں ہے زبان میں کہیں کہیں ہندیت ہے۔ اس کے مقطعوں میں خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس میں ہندس کی مناسبت سے کوئی بات ضرور پیدا کرتا ہے۔ مثلاً

ہندس اگر چہ آگہ بود زیں پیش ‌ ‌ ‌ ‌ دانش کرد قانون شفا را

•

باشد زفلک ہندس آگاہ ‌ ‌ ‌ ‌ با آنکہ نشستہ بر زمین است

•

اے مہر چہرہ چشم ہندس بے رخت ‌ ‌ ‌ ‌ از حضیض خاک تا اوج ثریا آتش است

•

رو ہندس بعلم یک دو شکل ‌ ‌ ‌ ‌ ایں ہمہ افتخار بے معنی است

•

اے ہندس رو کہ در علم نظر ‌ ‌ ‌ ‌ احتیاج مسطر و پرکار نیست

•

ہاں حرف زمیں بگو ہندس ‌ ‌ ‌ ‌ تاکے زفلک کنی حکایت

•

از ہندس مپرس سر نہاں ‌ ‌ ‌ ‌ کیں معما زہیچ کس نکشود

•

ذیل کے مقطعوں میں اس ہندس کے لفظ سے کتنا لطیف استدلال کیا ہے۔

درحقِ من گمانِ خطامی بری خطاست ۔ ہرگز شنیدۂ کہ مہندس خطا کند

تا یکے شکلِ زمیں خواہی کشید ۔ روہندسِ صورتِ افلاک کش

کہنہ شد آسماں مہندس خیز ۔ تا بناہائے نو نہادہ شود

حسب ذیل غزل اس کے بہترین کلاموں میں سے ہے۔

یاراں ہلالِ عید برآمد نظر کنید ۔ ماہِ صیام رفت، مئواں را خبر کنید
یاراں دگر بکوریِ مفتی و محتسب ۔ امروز خاکِ میکدہ کحل بصر کنید
آں کس کہ از برآمدنِ مہ خبر کند ۔ اورا باحترام دہن پر شکر کنید
اکنوں رسید کوکبۂ عیش و انبساط ۔ اے دردوغم ز مملکتِ دل سفر کنید
گر درمن ونگار مہندس شود حجاب ۔ دستش گرفتہ زود ز محفل بدر کنید

ذیل میں اس کے دیوان کے وہ اشعار نقل کیئے جاتے ہیں جن سے اس کے کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا نام :-

باش لطفِ اللہِ احمد چہ کنی فخر بعلم ۔ جہل ازیں علم تو بہتر کہ نیاید بعمل

خواہم کہ کشم بادہ چو لطف اللہِ احمد ۔ تا چند کشم محنتِ دورِ قمری را

ہمچو لطف اللہِ احمد کوسِ دانش میزدم ۔ چوں شدم عاشق بجہلِ خویش کردم اعتراف

ان شعروں میں لطف اللہ اس کا، اور احمد اس کے باپ کا نام ہے۔ لاہور اس کا وطن تھا۔

کے بود آمدنِ قاصدِ فرخندہ پیام   مدتے شد کہ ز لاہور نیامد خبرے

ہندسہ، منطق و حکمت میں اس کو غلو تھا،

برمنِ ہیچمداں کشف شد از فیضِ ازل   راز سربستہ کہ بر ہندسہ داں مشکل بود
صرف در منطق و حکمت شدہ ایں عمرِ عزیز   لیک آں نکتہ نخواندم کہ در و حاصل بود

معماری و ہندسی میں نامور تھا،

لطف اللہِ معمارِ ہندس شد رو استاد   گر کار رو را بہ نکند پس چہ کند کس

درس و تدریس کا بھی شغل تھا،

عمر در درس بسر بردی و در آخرِ کار   ہیچ حاصل نہ شد اندر سرِ جز بحث و جدل

لیبی شہزادہ کے نام ایک مثنوی ہے جس سے مراد غالباً دارا شکوہ ہے کہ "شہزادہ بلند اقبال" کے نام سے وہی مخاطب تھا۔ اس میں وہ کہتا ہے،

لطفِ شہ مے کند مددگاری   ورنہ آگہ نیم ز معماری
خواندہ ام یک دو نسخہ از ہر باب   ہیئت و ہندسہ نجوم و حساب
نہ نویسم ز بیم بے ادبی   کہ چہا خواندہ ام من از عربی

. . . .

لطفِ شہزادۂ بلند اقبال   گر شود بندہ را معاونِ حال
خدمتے بندہ را العفو باید   کہ از و علم رفتہ باز آید
گر یکے از مقربانِ بساط   در دمِ عیش و در زمانِ نشاط

ایں سخن از مقیمِ ایں درگاہ — برساند بسمعِ حضرتِ شاہ
اجر باید نہ کرد گار کریم
نہ کہ اجرِ قلیل اجرِ عظیم

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ داراشکوہ کے توسط سے شاہجہان تک پہنچا چاہتا ہے۔ کہیں کہیں غزلوں کے مقطع میں بھی ادھر اشارہ ہے۔

ہاں مہندس بندۂ شاہِ بلند اقبال باش
آنکہ گر فرماں دہد جمشید فرماں بر شود

ایک مثنوی میں کسی ایسے خانوادۂ وزارت کے کسی رکن کی مدح وہ کرتا ہے جس کو سیادت کی عزت بھی حاصل تھی۔

اخترِ برجِ حشمت و اجلال — گوہرِ درجِ دولت و اقبال
نیّرِ آسمانِ بینائی — آفتابِ سپہرِ دانائی
منبعِ جود مخزنِ احساں — مظہرِ فیض و معدنِ ایقان
زبدۂ دودمانِ مصطفوی — نخبۂ خاندانِ مرتضوی
امرا را شرف امارتِ او — وزرا را شرف وزارتِ او
امرا از امارتش منصور — وزرا از وزارتش دستور

آبِ شرع است سیفِ مسلولش
دستِ عدل است رمحِ مصقولش

میرا خیال ہے کہ اس مدح کا موضوع وہی ہستی ہے جس کے نام پر شاعر نے اپنی کتاب منتخب الحساب لکھی ہے یعنی "خلاصۂ دودمانِ سیادت، منتخب خاندانِ وزارت

میر محمد سعید بن میر محمد یحییٰ ادام اللہ اقبالہ و ضاعف جلالہٗ"
لطف اللہ اور اس کے بھائیوں کی تصانیف سے یہ ہویدا ہے کہ ان لوگوں کو شاہجہان کے بعد جس سے تعلق رہا ہے وہ شہزادۂ دارا شکوہ ہے چنانچہ لطف اللہ کے بھائی عطاء اللہ رشیدی نے اپنا رسالہ خلاصۃ الراز شہزادہ موصوف ہی کے نام سے معنون کیا ہے لطف اللہ کے اس دیوان کے اکثر اشعار سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس کو اسی شہزادہ کے دربار میں رسوخ و اعتبار حاصل تھا۔ نعت کے بعد جو پہلا قصیدہ اس دیوان میں ہے وہ اسی کی مدح میں ہے۔

بدستیاریِ لطفِ شہ بلند اقبال ‏ ‏ ‏ بلند پایہ زمن گشت قدرِ معماری
سپہر مرتبہ دارا شکوہ دریادل ‏ ‏ ‏ کہ ہمچو ابر کفش می کند گہرباری

اُس کی ایک غزل کا ایک مطلع ہے

اے شاہِ زمن بیا و بنگر ‏ ‏ ‏ در دلِ من بیا و بنگر

اس کی دوسری غزل کا مطلع ہے،

گر بادشہ بلطف نظر بر گدا کند ‏ ‏ ‏ بر بادشہ نظر بعنایت خدا کند

ایک پوری غزل مدح میں ہے،

اے زجودِ تو کامرانیِ دھر ‏ ‏ ‏ وز وجودِ تو پاسبانیِ دہر
بخدائے خدایگانِ زماں ‏ ‏ ‏ بتو زیبا خدایگانیِ دھر
دہر را مدح تو وظیفہ بود ‏ ‏ ‏ گوش کن بر وظیفہ خوانیِ دھر
بتو زیبا است خلعتِ شاہی ‏ ‏ ‏ زتو پیدا است کامرانیِ دہر
باشد از لطفِ تو ھندستں شاد ‏ ‏ ‏ اے زلطفِ تو شادمانیِ دہر

ان موقعوں پر لفظ لطف کا لطف اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہیں
ایک اور مدحیہ غزل سنئے جس کے مطلع میں دادا بیٹا اور پوتا تینوں کے نام یکجا ہیں

داراشکوہ ، شاہجہاں بانیِ جہاں
بروے مبارکست سلیمانیِ جہاں

شاہجہاں، داراشکوہ بن شاہجہاں اور سلیمان شکوہ بن داراشکوہ بن شاہجہاں

پروردگار باد نگہبانِ دولتت | زانروکہ کارِتست نگہبانیِ جہاں
تازآب وآتش است نشانِ زمانہ باد | روشن زخاکپائے تو پیشانیِ جہاں
اے بانیِ جہاں کہ جہاں در ثنائے تست | یک لحظہ گوش دار ثناخوانیِ جہاں

تا کے مہندس است پریشاں چو زلفِ یار
اے از تو دور گشتہ پریشانیِ جہاں

ایک قطعہ ہے۔

دولتِ جاوید و بختِ سرمد و ملکِ دوام | ہمعنان و ہمدم شاہ و بلند اقبال باد
از کفِ و بتفش زروگوہر ریزد در بارگاہ | تا ابد دریا و کاں زیں فیض مالامال باد
می کند احسانِ او در ماندگاں را یاوری | یاور او ایزد ذوالمجد و الافضال باد

دوسرا قطعہ

ثناخوانِ ترا شاہا چہ حاجت مدح جم گفتن | بجامِ بادہ حاجت نیست مست جامِ سرّ را
چو می خواہد کہ باشد بانیِ قصر ثنائے تو | بکارِ خشت و گل مگذار لطف اللہ احمد را

اس قطعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ معماری کے پیشہ کو اپنے سے کم درجہ مانتا تھا۔
داراشکوہ نے اس سے اپنا محل بنوایا ہے۔ اس کی تاریخ نکلتا ہے۔

چو بنا کردہ قصرِ جاہ و جلال　　　ظلِ حق بادشاہِ عالی ملک

شبہۂ ایں عمارتِ والا　　　تافت چوں مہر بر حوالیِ ملک

گفت معمارِ قصر، تاریخش　　　قصرِ داراشکوہ والیِ ملک

اس مصرع سے تاریخِ بنا سنہ ۱۰۶۰ھ نکلتی ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ داراشکوہ کا یہ قصر اسی شاعر معمار نے بنایا تھا۔ داراشکوہ نے کوئی کنجی بنوائی ہے۔ اس کی تاریخ کہی ہے:

چو طیار شد ایں کلیدِ ظفر　　　بفرمانِ دین پرور حق پژوہ

پئے سالِ تاریخ انجام شے　　　خرد گفت "مفتاحِ داراشکوہ"

"مفتاحِ داراشکوہ" سے سنہ ۱۰۶۲ھ نکلتے ہیں جس کے ایک سال بعد داراشکوہ کی تاریخ کا صفحہ بدل جاتا ہے۔ داراشکوہ کے بیٹے سلیمان شکوہ کی کدخدائی کی تاریخ یہ لکھی ہے:

کدخدا گشت باقبالِ بلند　　　پورِ دارائے زماں شاہِ زمیں

در زمانے کہ مراداتِ جہاں　　　بود در دست چو در دستِ نگیں

گفت جبریلِ امیں تاریخش　　　بسلیماں شدہ بلقیس قریں

آخری مصرع سے سنہ ۱۰۶۴ھ نکلتے ہیں۔

اوپر کے اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا اور اس کے خاندان کا تمام تر تعلق داراشکوہ سے تھا۔ اہلِ تاریخ نے اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ پیدا کرنا بہت آسان ہے۔ یعنی یہ کہ اس کو داراشکوہ سے جس قدر وابستگی ہوگی۔ اسی قدر عالمگیر کے دربار سے اس کو دوری ہوگی۔ داراشکوہ کے مدحیہ قصیدہ میں کچھ ایسے شعر بھی ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا

ہے کہ ان میں دارا شکوہ کے حریف مقابل یعنی اورنگ زیب پر طعن و تعریض ہے۔ مثلاً

زہیبتش نہ تواں یافت نیم قطرۂ خواب ہزار بار بدلِ خصمش ار ببفشاری

بزخمِ تیر کہ زد در دلِ معاندِ او ربودہ رنگِ دلم را سپہرِ زنگاری

وراں دیار کہ بختِ حسودِ تست بخواب ندیدہ دیدۂ مردم بخواب بیداری

مدام باد ہوا خواہِ دولتِ تو بعیش نصیبِ خصمِ تو جاوید باد خونخواری

ان اشعار میں "خصم" اور "معاند" اور "حسود" سے غالباً اورنگ زیب ہی کی طرف اشارہ ہے۔ اس بنا پر ۱۰۶۸ھ کے انقلاب میں حسبِ "شہزادۂ بلند اقبال" کی جگہ اورنگ زیب عالمگیر، زیبِ اورنگ ہوا تو اس شخص کی کس مپرسی محتاجِ بیان نہ ہوگی۔ لطف اللہ کے دیوان میں ایک قطع بند غزل ہے۔

شہا گوش بہ دادخواہی نداری بحالِ گدایاں نگاہے نداری

رقیباں بقتلم نوشتند فتوے وگرنہ تو ہرگز گناہے نداری

جہاں سربسر خیر خواہِ تو باشد ولے ہمچو من خیر خواہے نداری

نیاری صبا سوئے بلبل پیامے مگر سوئے گلزار راہے نداری

مہندس از آں رو نداری وقارے

کہ چوں زاہداں خانقاہے نداری

میرے خیال میں اس غزل کا خطاب اورنگ زیب ہی کی طرف ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس کو دارا شکوہ کے عہد میں اس گلہ و شکایت کا موقع نہ تھا اور نہ زاہدوں کی خانقاہ پر تعریض کی حاجت تھی،

اوپر کے اشعار میں مہندس نے اپنی تعمیری مہارت فن کا بھی جا بجا اظہار کیا ہے

کہتا ہے۔ ع

"بلند پایہ زمن گشت قدرِ معماری"

ایک جگہ فخریہ کہتا ہے ع

"ما ہمہ معمار و عمارت گریم"

ایک جگہ کہتا ہے کہ میرے بنائے ہوئے نقشے آفتاب کی طرح روشن ہوتے ہیں

چناں منیر شود شبہۂ عمارتِ من — کہ نورِ مہر بود نزدِ نورِ او تاری

دمے کہ من بعمارت گری شوم مشغول — ملک مصالح کار آورد بسر باری

مگر با ایں ہمہ یہ نہیں معلوم کہ اس کی بنائی ہوئی عمارتیں کون ہیں۔ اوپر کے ایک تاریخی قطعہ سے دارا شکوہ کے ایک محل کے بنانے کا حال معلوم ہوتا ہے۔ "تذکرہ سفینۂ خوشگو" اور نشترِ عشق حسین قلی خاں میں ۱۲۹۵ھ میں۔ مہندس کے بیٹے ریاضی کے حال کے ضمن میں ہے "ملا لطف اللہ مہندس متخلص لاہوری است کہ قلعہ ارک دارالخلافہ شاہجہان آباد بتجویز و صوابدید او بنا یافتہ" (خوشگو) اس سے معلوم ہوتا ہے قلعۂ دہلی کے شاہجہانی عمارات کی تعمیر میں یہ بھی اپنے باپ اور چچا کے ساتھ شریک تھا۔ سحر حلال میں یہ اپنی نسبت لکھتا ہے:-

"مملک ہوا دار ولد احمد معمار گو ہر عمر را در کار گاہ و گل کا سد کردہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس فقرہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر کا بڑا حصہ عمارت گری میں صرف ہوا۔

۷۔ سحرِ حلال:- یہ فارسی رسالہ علمِ اخلاق میں ہے اور صنعتِ غیر منقوطہ میں لکھا گیا ہے۔ اسی لئے مصنف کا نام لطف اللہ کے بجائے "ولد احمد معمار" لکھا گیا ہے۔ اس کے شروع کی عبارت یہ ہے:-

اللہ علا اسمہ درکلام حمد کردگار آوردم مالک، ملک، علام واحد صمد سلام ۔ ۔ ۔ ''

حمد و نعت کے موضوعوں کے بعد وہ صفحوں میں مدح داور کامگار ادام اللہ ملکہ'' کے
عنوان سے بادشاہِ عصر کی تعریف کرتا ہے ۔ ممدوح کا نام حسب ذیل صورتِ معمہ میں ہے

" اسم اکرم او حامل دو کلمہ آمد کلمۂ اول سرِ عدل و دلِ داد (الف) و دلِ علم و سرِ مراد (کرم)
سرِ گل و دلِ سرو و در سرِ گل و دلِ سرد دہ ور آمدہ (ی)، ملک علام صمد سلام ہمواره
سرِ داور را محو رسمائے کرم و گل اور احسود و وحدِ ارم دارا د"

اس صورتِ معمہ سے جو نام نکلتا ہے ۔ وہ عالمگیر ہے ۔ تعجب ہوتا ہے کہ دارا شکوہ کے مداح
نے عالمگیر کی مدح کیونکر لکھی، شاید اس اخلاقی رسالہ کو عالمگیر کے نام سے پیش کر کے اس
کی ہمدردی اپنی طرف مائل کرنی چاہی جو معلوم نہیں کہ ہوئی یا نہیں ۔

بادشاہ کی مدح کے بعد '' مدح رسالہ و حال محرر اصلح اللہ حالہ'' کے عنوان سے تین صفحوں
میں اپنا اور اپنے رسالہ کا حال لکھا ہے جس کا اقتباس درج ذیل ہے ۔

" مملوک ہوادار ولد احمد معمار رسالہ کہ مداوا و محل مدامع اہلِ حال آمد ۔ ۔ ۔ ۔
حاملِ سطور معہ ۔ وہ کردہ در درگاہ سالار کامگار ادام اللہ ملکہ آوردہ ۔ ۔ ۔ ۔
ماموں کہ ہمہ حال سعد ۔ ۔ ۔ ۔ در مطالعہ والا در آمدہ معلوم مدرکۂ اکرم گردد ۔ ۔ ۔ ۔
سرورا، مملوک ہوادار ولد احمد معمار گو ہر عمر را در کارگاہ و گل کاسد کردہ ۔ ۔ ۔ ۔
مسئول کہ ہر کس وہ مسالک علم ۔ ۔ ۔ ۔ اطلاع دارو رسالہ مملوک ہوادار اصلاح دہد احمد معمار
والد مملوک دادار سہ ولد دارد، اول عطاء اللہ سلمہ اللہ سالک مسالک علم و حال و در اصل
مراحل صعود و کمال عالم و عامل و علامۂ عصر کہ در او علم و عمل آمدہ حصر رسالہ ما در علم اعداد
مسطور کردہ، حامل صلاح و کسور رہ ولد دوم اوسط ہر سہ مملوک در گاہ و کردگار دوم مملوک
حامل دو کلمہ آمد کلمہ ۔ ۔ ۔ اول علا اسمہ کلمہ دوم ۔ ۔ ۔ لامہ و طاء و معاد اعد عطاء

والہ سوم در رسائل علم و حال و مراحل سعود و کمال مسماۃ عطاء اللہ آمد و اسم او ہم دو کلمہ و ...د کلمۂ دوم "اللہ" علا اسمہ و کلمۂ اول معادل عدد عطا و داد و رائے اصلح اللہ حالہ حصول اللہ اما الہم علوم اہلِ علم گردد کہ اسم رسالہ والا سحر حلال آمد ... معلوم اہلِ کمال کہ سحر حلال را در ماہ محرم الحرام مسطور کردہ، سالِ رسم سحر حلال ملہم اہلِ حال و معلم اہلِ کمال را سوال کردم عدد او داد کہ سحر حلال در رو اہلِ حال آمد و ورد رسالہ لوحِ کمال۔

اس آخری فقرہ سے رسالہ کی تصنیف کی تاریخ ۱۰۷۲ھ نکلتی ہے۔

اس تمہید کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جس میں مختلف اخلاقیات کو سرِ عنوان بنا کر مدح و ذم لکھا گیا ہے۔ مثلاً مدحِ عدل، مدحِ سماح، ذمِ امساک، ذمِ حسد، ذمِ طولِ امل، ذمِ حرص و طمع، ذمِ کسل، مدحِ کد، مدحِ علم، مدحِ دلدار و حالِ اہلِ دل، ہوسِ وصلِ دلدار، حصولِ وصلِ دلدار، ذمِ ہوس و دوامِ وصال، مدحِ عمل، مدحِ سرود، کلامِ اہلِ دل۔ اسی پر رسالہ ختم ہو گیا ہے۔

اس رسالہ کے دو نسخوں کا مجھے علم ہے۔ پہلا مدرسہ محمدی مدراس کے کتب خانہ کا جس کا نمبر ۶۰۶ ہے۔ اس نسخہ کو غلام عبد القادر المخاطب بہ قادر عظیم خان نے ۱۲۱۱ھ میں نقل کیا ہے جو مدراس کے ایک مشہور علمی خاندان کے رکن[1] تھے۔ یہ نسخہ ۲۹ صفحوں میں ہے۔

دوسرا نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے جس کا نمبر اس کے کیٹلاگ میں جلد ۱۸ ہے اور صفحہ ۱۰۷۔ اس کو ابھی ابھی ہمارے مخلص دوست پروفیسر شیخ عبد القادر (پونہ) نے مرتب کر کے شائع کیا ہے[2]۔

---

[1] اس خاندان کے نوجوان رکن جناب محمد غوث صاحب ایم۔ اے (حیدرآباد دکن) کا ممنون ہوں کہ انہوں نے میرے لئے اس رسالہ کے اقتباسات میری فرمائش پر نقل کر کے بھیجے۔

[2] اس کیٹلاگ کے فاضل مرتب نے اس رسالہ کا مصنف لطف اللہ کے چھوٹے بھائی نور اللہ کو ظاہر کیا ہے۔ یہ کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔

(۳)

امام الدین الریاضی :۔ یہ لطف اللہ مہندس کا بیٹا اور استاذ احمد کا پوتا ہے ریاضیات کے اسں ریاضِ علم کا یہی وہ نونہال ہے جس کے تذکروں کی خوشبو بارہویں صدی کے اہلِ تذکرہ کی محفل تک پھیلی ہوئی ہے۔ خوشگو نے اپنے سفینہ میں حسین قلی خان عظیم آبادی نے اپنے نشترِ عشق میں کشن چند اخلاص نے اپنے "ہمیشہ بہار" میں اور احمد علی خان سندیلوی نے اپنے "مخزن الغرائب" میں ان کے حالات لکھے اور ان کے فارسی اشعار نقل کئے ہیں اور اسی ضمن میں ان کے بعض بزرگوں اور عزیزوں کے احوال کی طرف بھی اشارات کئے ہیں۔ سفینہ خوشگو میں ہے :۔

" مولوی امام الدین ریاضی تخلص خلف ملا لطف اللہ مہندس تخلص لاہوریست که قلعۂ ارک دار الخلافۂ شاہجہان آباد بتجویز و صوابدید او بنا یافتہ، و از عہد جد خود بدار الخلافہ سکونت دارد، در جمیع علوم رسمی یگانہ و منفرد بود خصوص در ریاضیات

تصانیف معتبر دارد، و با ایں ہمہ قناعت و ریاضت مازپور حال و مآل خود ساختہ
ابدہ بس و افادات مشغولی داشت و دریں جزو زمان از مغتنمات بود اگرچہ بنا بر
اشتغال علمی بفکر سخن کم می پرداخت، لیکن سلیقہ بار درست داشت، و در جوابہائے
پائے کلم می آورد، و در سال ہزار و صد و ہیچ رحلت کرد، و امروز ملا ابوالخیر
معروف بخیر اللہ برادر اعیانی او . . . . . ذخیر اللہ کی رصد بندی کا تذکرہ
جس کا ذکر اس کے حال میں آئے گا)

پھر مولانا ریاضی کے چند فارسی اشعار کا انتخاب ہے۔

حسین قلی خان عظیم آبادی 'نشتر عشق' میں لکھتے ہیں:۔

"مولانا امام الدین نام، خلف مولینا لطف اللہ مہندس لاہوریست کہ قلعۂ
ارک شاہ جہان آباد برائے وی بنیاد شدہ، مدۃ العمر خود، در شاہ جہان آباد گذرانیدہ
چوں وی بعلم ریاضی تفوق بر ابنائے جنس داشت، و در ورع و پرہیزگاری بے
مانند بود، لہذا تخلص خود ریاضی مے کرد، و گاہ گاہے فکر بہ تلاش سخن ہم می گماشت
. . . در سنہ یک ہزار و یک صد و چہل و پنج بگل چینی ریاض جنان شتافت"

حسین قلی خان نے ان کی تاریخ وفات کا یہ قطعہ لکھا ہے:۔

بگفتہ عاشقے با آہ و دل سوز ‌‌ ‌ ‌ برفتہ چوں امام الدین ز دنیا
بدیع و صرف و معنی در ریاضی ‌ ‌ ‌ ‌ شد ندای وای بے ادب بے سر و پا

کشن چند اخلاص نے اپنے تذکرہ 'ہمیشہ بہار' میں ان کا تذکرہ بڑے اخلاص کے ساتھ

ے اس کا نسخہ بانکی پور لائبریری میں نظر سے گذرا

چند صفحوں میں لکھا ہے جس کی ایک ایک سطر سے اس کی عقیدت مندی اور نیاز مندی کا
ہوتا ہے خصوصاً ان کے زہد و استغنا اور سلاطین و امراء کے درباروں سے ان کی بے
کی تعریف کی ہے، ابتدائی سطریں یہ ہیں:۔

"...... اصل وطنِ ایشان دار السلطنتہ لاہور است و جدِ شریف آں دانائے
اسرار کونی و الٰہی آمدہ، در دار الخلافتہ شاہ جہان آباد اقامت گرفتہ، و والدِ شریف
ایشان مولوی لطف اللہ مہندس کہ ایشان ہم گاہ گاہے میل بشعر مے کردند، و
مہندس تخلص می فرمودند، و در علم ریاضی خیلے یدِ علیا داشتند۔"

پھر چند صفحوں میں ان کے زہد و اتقا کے حالات لکھے ہیں اور ان کے شاعرانہ کم
ایک دو واقعے نقل کئے ہیں۔

احمد علی خان سندیلوی نے تذکرہ مخزن الغرائب میں جو ۱۲۱۸ھ میں لکھی گئی ہے
لفظی تغیر سے وہی کچھ لکھا ہے جو اخلاص نے بیان کیا ہے۔ چنانچہ اس میں ہے:۔

"مولانا امام الدین ریاضی اصل وطن ایشان بلدۂ لاہور است، جدش توطن
در دہلی اختیار کردہ، پدرش مولوی لطف اللہ مہندس بودہ است، ایشان ہم بگفتن
اشعار میل تمام داشتند و مہندس تخلص می کردند، و در علم ریاضی مثل این ہر دو
و پسر در بلادِ ہند نبودہ اند، ہر چند مولانا ریاضی بگفتن شعر توجہ نداشت، روز و شب
بہ تدریس مشغول بود۔"

تذکرہ صبحِ گلشن میں ہے:۔

"ریاضی امام الدین فرزند مولانا لطف اللہ مہندس لاہوری کہ قلعۂ ار
شاہ جہان آباد بصوابدید رای رزینش بنیاد گرفتہ، ریاضی متوطن شاہ جہان آ

گردیده، از آن شہرہ مدۃ العمر بیروں نرفتہ ماہر علوم درسیہ بودہ ادور سبق علم ریاضی از معاصرین قصب السبق ربودہ، درعبادت و ریاضت و زہد عدیل خود نداشتہ"

تاریخ علمائے ہند میں یہ سطریں ہیں :-

" ملا امام الدین دہلوی در اصل لاہوری است، ریاضی دان بود کہ بدہلی توطن گرفتہ شرحے مختصر بہ تشریح الافلاک مصنفہ بہاء الدین آملی در سال یازدہ صد و سہ ہجری نوشتہ کہ بنام التصریح فی شرح التشریح شہرت دارد"

(ص ۲۶۲ نولکشور)

عام طور سے اس کی یہی تصنیف تصریح جو بہاء الدین آملی کے مشہور متن تشریح الافلاک کی شرح ہے۔ لوگوں میں مشہور ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے عصمۃ اللہ سہارنپوری نے ۱۰۸۶ھ میں اس کی مفصل شرح لکھی ہے جس کا نام باب تشریح الافلاک ہے اور جو چھپ بھی گئی ہے۔ تاہم علم ہیئت میں عربی درس گاہوں کی سب سے ابتدائی اور مختصر ترین کتاب یہی ہے۔ اس لئے بہت متداول ہے۔ مصنف نے دیباچہ میں اپنا نام اس طرح لکھا ہے۔

" اما بعد فیقول العبد الضعیف امام الدین بن لطف اللہ المهندس اللاهوری ثم الدهلوی"۔ (دیباچۂ تصریح)

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان گو در اصل لاہور کا رہنے والا تھا۔ مگر بعد کو شاید شاہی تعمیرات کے تعلق سے دہلی آکر آباد ہو گیا تھا۔

مہندس کی وفات ۱۰۹۳ھ

امام الدین نے اپنی اس تالیف (تصریح) کا سنہ دیباچہ میں ۱۱۰۳ھ لکھا ہے اور ہم کو معلوم ہے کہ لطف اللہ کم از کم

سنہ ۱۰۹۳ھ تک زندہ تھا کہ اس کی تصنیف منتخب اسی سال تالیف پائی ہے اور اس کے گیارہ برس کے بعد اس کا بیٹا تصریح لکھتا ہے۔ اس سے یقینی طور سے ثابت ہوتا ہے کہ باپ ہی کے عہد میں بیٹا علوم و فنون کی تکمیل کر چکا تھا یا کر رہا تھا۔ اس سے ہم کو یہ قیاس کرنے کا حق ہوتا ہے کہ غالباً اُس نے اپنے باپ ہی سے علوم ریاضی کی تعلیم حاصل کی ہوگی۔ تذکرہ میں اس کی تاریخ وفات سنہ ۱۱۴۵ھ (سنہ خمس واربعین ومائتہ والف) لکھی ہے۔

تصریح کے دیباچہ میں ہے کہ "یہ شرح اس نے بھائیوں اور دوستوں کی فرمائش سے لکھی ہے"۔ اس سے مراد اس کے شاگردوں کی جماعت ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ وہ خود بھی درس و تدریس کے موروثی پیشہ میں مشغول تھا۔ چنانچہ سندیلوی نے تصریح بھی کی ہے کہ "روز و شب بہ تدریس مشغول بود"۔

رام پور کے کتب خانہ میں اس کی کتاب تصریح کے دو نادر نسخے ہیں جن میں سے ایک کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تصنیف کی تاریخ سے بارہ برس کے بعد سنہ ۱۱۱۵ھ میں لکھی گئی ہے اور دوسرے کی اہمیت یہ ہے کہ وہ سنہ ۱۲۱۱ھ میں اس نسخہ سے منقول ہے جو خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ پہلے نسخہ کا نمبر ۱۱۵ اور دوسرے کا ۱۱۶ (فن ہیئت) ہے۔

مصنف نے اپنی اس شرح پر حواشی بھی لکھے تھے۔ چنانچہ رامپور کے نسخہ نمبر ۱۱۶ پر مصنف کے یہ حواشی موجود ہیں۔ ہمارے استاذ مولینا حفیظ اللہ صاحب سابق مدرس اعلیٰ مدرسہ عالیہ رامپور و دار العلوم ندوۃ العلما لکھنو نے تصریح پر جو حاشیہ اپنے قیام رامپور کے زمانہ میں سنہ ۱۳۱۱ھ میں لکھا تھا اور جو مجتبائی دہلی میں چھپا ہے۔ اس کے آخر میں محشی نے تصریح کی ہے کہ انہوں نے شارح کے ان حواشی سے جو اس کے ہاتھ کے نوشتہ نسخہ سے منقول ہیں استفادہ کیا ہے (خاتمہ حاشیہ تصریح مطبوعہ مجتبائی دہلی)

امام الدین نے دو اور کتابوں پر بھی حاشیے لکھے ہیں جن میں سے ایک قاضی زادہ رومی کی مشہور فلکی تصنیف شرح چغمینی پر ہے۔ نوابی اودھ کے زمانہ میں علی بخش خان کے مطبع علوی میں معتمد الدولہ احسان الملک کپتان مرزا مہدی علی خان بہادر ثابت جنگ قبول کے زیر اہتمام شرح چغمینی کا جو نسخہ متعدد علماء کے حواشی اور تعلیقات کے ساتھ چھپا ہے۔ ان میں ایک امام الدین الریاضی بن لطف اللہ المہندس الدہلوی کے حاشیہ کے بھی منقولات اور حوالے ہیں چنانچہ کتاب کے خاتمہ میں اس حاشیہ کا ذکر ہے۔

امام الدین کا دوسرا حاشیہ خود اس کے باپ کی کتاب "شرح خلاصۃ الحساب" پر ہے یہ حاشیہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے۔ اس کا نمبر ۱۶۷ ہے۔

امام الدین بھی اپنے باپ کی طرح فارسی کا شاعر تھا اور ریاضی اس کا تخلص تھا۔ کشن چند اخلاص اور سندیلوی کا بیان ہے کہ گو مولینا ریاضی کو اپنے درس و تدریس سے شعر گوئی کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ تاہم انہوں نے طالب آملی کے ایک مطلع کا جس کا جواب نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسا جواب لکھا جو بڑے بڑے شعرا کی قدرت سے باہر ہے۔ طالب کا مطلع تھا،

بتن یویا کنند گلہائے تصویر خیالی را
بیا بیدار سازد خفتگان نقش قالی را

اخلاص اور سندیلوی کہتے ہیں کہ اس کا جواب شاعروں سے اب تک نہیں ہو سکا تھا۔ یہاں تک کہ میاں ناصر علی" کو ان کے دوستوں نے اس زمین میں کچھ کہنے کی فرمائش کی تو صاف کہا کہ "این زمین را طالب برد چیزیکہ ماندہ است درد است"۔ مرزا صاحب جیسے شاعر غرا" نے جب اس غزل کا جواب لکھا تو سپر ڈال دی اور قالی اور نہالی کا مطلع نہیں

لکھا۔ بلکہ یہ مطلع کہا کہ

تکلف نیست در گفتار رندِ لا اُبالی را
چنانت دوست میدارم کہ عاشق شعر حالی را

لیکن مولانا ریاضی نے اس کا جواب برجستہ لکھ دیا

رگِ گُل کرد آں گلچہرہ سہر تارِ نہالی را
ازیں اندیشہ گلہا داغ شد بر سینہ قالی را

مولینا کا مطلع جس نے سُنا اس نے کہا:۔

"ظاہراً ایں زمین در دو صاف داشت یکے را طالبا برد و دومی تا حال در جواہر خانہ قضا و قدر پنہاں بود، کہ نصیب مولانا شد"

ان تذکروں میں ان کے یہ چند شعر نقل کئے ہیں،

عنقا خدنگِ حسرتِ گمنامی منست | در قیدِ نام بود اگرچہ نشان نداشت
رفتی، و رفت لشکرِ دل در رکابِ تو | شہرم برنگِ مجلسِ تصویر جان نداشت
روشن دلیم و خاک نشینی عیارِ ماست | سیماب وار گشتہ شدن اعتبارِ ماست
آزادہ ایم مطلبِ ما ترکِ مطلب است | باز آمدن ز حاصلِ ہر کار کارِ ماست
ما خارِ غم بسینہ چو ماہی نہفتہ ایم | گلزارِ عشق داغِ دل خار خارِ ماست
دریا دل است یار و غم از ما دریغ داشت | خشک و تری بپائے گل افسوس خارِ ماست

زعشقِ یار چہ گویم کہ حالِ من چون ست | غمم بدور خطش از احاطہ بیرون است
ندانم ار چہ شدی سنگدل کہ بیمار است | بجان رسید و نپرسی کہ حالِ او چون ست

ساتویں شعر میں دیکھئے کہ ریاضی کی جھلک دوررِ خط اور اہاطہ میں موجود ہے بیغینہ خوشگو میں یہ دو شعر اور ہیں :-

پایۂ عشق بلندی ز سرِ دار گرفت ۔۔۔ ہر کہ دریافت چو منصور سرے سر دارست

یوسفستانِ معانی است ریاضی بخنت ۔۔۔ چاکِ پیراہنِ نظمم تو عجب بازاریست

امام الدین ریاضی نے تصریح کے دیباچہ میں جو چند لفظ لکھے ہیں ۔ ان سے اور کشن چند اخلاص کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تربیت و دامنِ ہیں ریاضیات کے کئی مستعد شاگرد پل کر جوان ہوئے ۔ اخلاص کے تذکرہ ہمیشہ بہار میں ہے ۔

"دیکے از شاگردانِ ایشان برمجلی شرح فارسی نوشتہ، خیلے بتفصیل۔"

پھر لکھا ہے :-

"عزیزے در حق بعضے از شاگردان ایشان گفتہ ۔ ع
توئی در ہر فنے چوں مردمک فن"

اس کے بعد یہ ہے :-

"شاگردانِ ایشان در ریاضی تصانیف رائقہ ذائقہ دارند۔"

خیر اللہ بن لطف اللہ ۔ لطف اللہ مہندس کا یہ دوسرا لڑکا ہے ۔ اس کا پورا نام ابو الخیر المخاطب خیر اللہ خان مہندس ہے ۔ محمد شاہ کے عہد میں اس نے اپنا نام روشن کیا اور لفظ المخاطب سے ہویدا ہے کہ بادشاہ کے دربار تک اس کو رسائی حاصل تھی ۔ اپنے باپ کی طرح یہ بھی اپنے نام کے ساتھ مہندس لکھتا ہے ۔ غالباً اس نے تعلیم اپنے بڑے بھائی امام الدین سے پائی ہوگی جس نے ۱۱۴۵ھ تک زندگی پائی ہے ۔ تصریح کے دیباچہ میں امام الدین نے لکھا ہے کہ "اس نے اپنے دوستوں اور بھائیوں کی فرمائش

سے یہ شرح لکھی ہے۔ عجب نہیں کہ ان بھائیوں میں اس کا یہ بھائی بھی ہو۔ کشن چند اخلاص کے تذکرہ ہمیشہ بہار میں امام الدین ریاضی کے ذیل میں ہے: "یکے از شاگردان ایشان بر مجسطی شرح فارسی نوشتہ، خیلے تفصیل۔۔۔" آگے معلوم ہوگا کہ یہ شاگرد خود اس کا بھائی خیر اللہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خیر اللہ اپنے بھائی امام الدین کا شاگرد تھا۔ اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ محمد شاہ کے زمانہ میں راجہ جے سنگھ نے بادشاہ کے حکم سے دہلی، جے پور، بنارس اور اجین میں جو رصد خانے قائم کئے تھے۔ ان کا بانی اور نگران کار یہی نادرۂ روزگار تھا۔ آج سے پچیس چھبیس برس پیشتر میں نے یہ بات قیاساً لکھی تھی لیکن بحمد اللہ کہ آج اس کے ایک معاصر تذکرہ نویس بندرابن خوشگو المتوفی سنہ ۱۱۷۰ھ کی معاصرانہ شہادت سے یہ پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی۔ خوش گو اپنے تذکرہ سفینۂ خوش گو میں جس کا قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری میں نظر سے گذرا۔ امام الدین ریاضی کے حال میں لکھتا ہے۔

> "وامروز ملا ابوالخیر معروف بخیر اللہ برادرِ اعیانی وی در ہیئت و ہندسہ و اکثر علوم یگانہ روزگار است چنانچہ راجہ دھیراج جے سنگھ سوائے زمیندار انبیر در این ایام خیال رصد بستن در پیش داشتہ، قریب بست لک روپیہ در بست سال صرف این کار نمودہ باستصواب ابوالخیر مذکور است و حق آنست کہ ذاتش اد بر زمانہ منت است۔۔۔"
>
> (سفینۂ خوش گو نمبر ۲ صفحہ ۱۲۳)

دلی میں اس رصد خانہ کے کام کے علاوہ ریاضیات کا درس بھی دیا کرتا تھا (دیباچہ

سہ الندوہ سنہ ۱۹ میں مضمون اسلامی رصد خانے،

تقریب التحریر) چنانچہ اُس کے شاگردوں میں سب سے پہلا نام اُس کے بیٹے محمد علی کا ہے۔
اس کی ایک معنوی یادگار انڈیا آفس لائبریری لندن اور کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر حیدرآباد دکن میں اور دو بانکی پور کے مشرقی کتب خانہ میں ہیں۔ ان میں سے ایک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں بھی ہے اور چوتھے کا ذکر علامہ غلام حسین جونپوری نے جامع بہادر خانی میں کیا ہے۔

۱۔ **تقریر التحریر**:۔ یہ خواجہ نصیر الدین طوسی المتوفی سنہ ۶۷۲ھ کی "تحریر اقلیدس" کا فارسی ترجمہ ہے۔ محمد شاہ کے زمانہ میں سنہ ۱۱۴۴ھ میں یہ ترجمہ جیسا کہ کتاب کے دیباچہ میں تصریح ہے۔ اس نے ختم کیا۔ کتاب کا آغاز ان فقروں سے ہے:۔

"شکر است مر خدائے را کہ از وست ابتدا بسوئے اوست انتہا و بدست اوست اختیار همہ چیزہا"

نواب سالار جنگ بہادر (حیدرآباد دکن) کے کتب خانہ میں اس کا جو نسخہ ہے۔ اس میں مترجم کا نام ابوالخیر بن لطف اللہ مہندس اور انڈیا آفس کے نسخہ نمبر ۲۳۹۶ میں "خیر اللہ خان بن لطف اللہ مہندس" درج ہے۔ جیسا کہ اس کی فارسی فہرست (جلد اول ص ۱۲۳۴) سے معلوم ہوتا ہے۔ اس حیدرآبادی نسخہ میں کتاب کا نام صاف "تقریر التحریر" تحریر ہے لیکن انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں اس کا نام "ترجمہ تحریر اقلیدس" لکھا ہے۔ حالانکہ یہ نام نہیں ہو سکتا۔ "تقریب التحریر" جس کا نام آگے آتا ہے اور جس کا نسخہ بانکی پور اور علی گڑھ کی لائبریریوں میں ہے۔ اس کے دیباچہ میں مصنف کے فرزند نے بھی اس کا نام "تقریر التحریر" بتایا ہے جو بجائے خود اور دوسری تصنیف کے نام کی مشابہت سے بھی نہایت موزوں ہے۔ انڈیا آفس کے نسخہ کی کتابت کی تاریخ یکم رجب سنہ ۱۱۹۴ھ ہے۔ اس کے پہلے صفحہ پر

یک حاشیہ ہے جس میں مذکور ہے کہ یہ نسخہ راجہ نند رام پنڈت نے مسٹر رچرڈ جانسن کے لئے لکھنؤ میں تیار کیا تھا۔ تعجب ہوگا کہ کبھی ہمارے بزرگوں کی ریاضی کی تصانیف سے استفادہ کے انگریز شائق علم بھی مشتاق تھے۔ حیدرآبادی نسخہ کو کسی شیخ احمد نے سنہ ۱۲۰۴ھ میں لکھا ہے۔

۲۔ **تقریب التحریر**۔ یہ خواجہ طوسی کی دوسری کتاب تحریر مجسطی کا فارسی خلاصہ ترجمہ مع شرح ہے۔ مصنف کا نام اس میں ابوالخیر المعروف بہ خیر اللہ المخاطب بہ خیر اللہ خان، المتخلص بالمہندس ابن لطف اللہ ہے۔ کتاب کا آغاز یہ ہے:۔

"ثنائے کہ از اندازۂ مہندس خرد بیرون است شایان صانعی کہ خالق سبع سماوات است"

(فہرست کتب خانہ مشرقی بانکی پور جلد یازدہم صفحہ ۷۰)

مصنف نے اس کے دیباچہ میں یہ بیان کیا ہے کہ تحریر اقلیدس کے ترجمہ کے بعد اس نے یہ کتاب محمد شاہ (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء - ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کی تخت نشینی کے اخیر ثلث (۱۱۶۱ھ) میں تالیف کی۔ اس کی شرح میں اس نے مولینا عبدالعلی برجندی کی شرح تحریر مجسطی سے مدد لی ہے۔ کتاب کا عام انداز یہ ہے کہ پہلے خواجہ طوسی کے عربی متن کا ایک فقرہ ہے۔ پھر اس کا فارسی ترجمہ پھر حسب ضرورت برجندی کی عربی شرح اور پھر خود خیر اللہ کی فارسی شرح ہے۔
اس کا ایک نسخہ بانکی پور کے مشرقی کتب خانہ میں ہے۔ ۲۲ر شوال ۱۲۵۱ھ کتابت کا سال ہے۔ کتاب کا نمبر ۱۰۵۸ ریاضیات فارسی ہے اور دوسرا مسلم یونیورسٹی لائبریری (نمبر ۶ علوم فارسی) میں ہے۔ فہرست میں اس کا نام ترجمہ مجسطی لکھا ہے۔ دونوں نسخے نظر سے گذرے ہیں۔

کتاب کا آغاز اس طرح ہے۔

یارب آسان کن بفضل شامل خود فتح باب   پس بلطف کامل خود ساز انجام کتاب

قال الفاضل الکامل المحقق والعامل الماہر المدقق استاذ الکل فی الکل عالم العلوم بالجیل الشارح المترجم بالفارسیۃ ابو العلوم العربیۃ ابو الخیر المعروف بخیر اللہ المخاطب بخیر اللہ خان سلمہ الرحمٰن المتخلص بالمہندس ابن لطف اللہ غفر لہ اللہ الحمد للہ رب العالمین ۔ ۔ ۔ اما بعد ۔ ۔ ۔ ۔ پوشیدہ نماند کہ چوں درس نفع شان ترجمۂ تحریر اقلیدس کہ از محقق طوسی با زیادت شرح بعض مقدمات بزبانِ پارسی برائے عموم فیض اتفاق افتادہ بود و بتقریب التحریر موسوم گردیدہ خواست کہ برائے اتمام خدمت عباد اللہ ترجمۂ تحریر مجسطی ہم کہ ازاں مدقق است بایراد بعض فوائد مرقوم رساند ، چنانکہ بفضل الٰہی جل جلالہ وعم نوالہ مسودۂ آں کتاب عظیم النفع در ثلثِ اخیر مدت سلطنت شاہ خلائق پناہ انجم سپاہ فردوس آرام گاہ محمد شاہ بادشاہ غازی علیہ الرحمۃ والرضوان فراغ دست دادہ بود ، و بتقریب التحریر مسمیٰ شدہ بسبب عدم دریافت قدردانی ارکان درحیز تعویق افتادہ بود ، بہ ترغیب بعض دوستان طالبِ این فن دراواسط سنہ احد جلوس (بادشاہ عالیجاہ احمد شاہ بہادر) از مسودہ اتفاق شروع مبیضہ افتاد در سنہ یک ہزار و یک صد و شصت و یکم ہجری مقدسہ صلعم"

علی گڈھ کا نسخہ جا بجا سے کرم خوردہ ہے اور بانکی پور کا نسخہ اچھا اور محفوظ ہے ۔ اوپر کی عبارت دونوں نسخوں کی تطبیق سے درست کی گئی ہے ۔ خاتمہ کی عبارت دونوں میں یہ ہے

" بعد از بیان سعی در حل این کتاب ، وصف خوبی ہائے آن و اعتذار سہو و خطا و طلبِ دعائے خیر و ختم بر صلوٰۃ و سلام حضرت رسالت پناہ ما ۔ ۔ ۔ ۔ فارغ شدم از تحریر ایں شرح و تصحیح آں ، روز یکشنبہ اوائل ذیقعدہ سنہ نہصد

ہشت ویک ہجریہ نبویہ . . . . بن لطف اللہ ہندس بن احمد"۔

• "سنہ نہصد و ہشت ویک" سراسر تحریف ہے۔ یہ حقیقت میں ہزار و یک صد و شصت ویک" (۱۱۶۱ھ) ہوگا۔ کہ یہی سال محمد شاہ کی وفات کا ہے اور اس نسخہ کے آغاز میں تصریح ہے کہ اس وقت بادشاہ ممدوح کی وفات ہو چکی تھی۔ گویا کتاب کا مسودہ محمد شاہ کی زندگی میں تیار ہو چکا تھا مگر ارکانِ سلطنت کی ناقدردانی سے یہ پڑا رہا۔ بالآخر شاہ مرحوم کی وفات پر ریاضی کے شائقین کے اصرار سے احمد شاہ کے پہلے سالِ جلوس میں اس کا یہ مبیضہ تحریر میں آیا۔

۴۔ حاشیہ بر شرح بیست باب در معرفتِ اسطرلاب "بیست باب در اسطرلاب" خواجہ نصیر طوسی کا ایک مشہور رسالہ ہے۔ اس کی شرح علامہ عبد العلی برجندی نے ۸۸۹ھ میں لکھی۔ اس پر خیر اللہ ہندس نے یہ حاشیہ لکھا ہے۔ یہ حواشی بانکی پور لائبریری کی شرح بست باب کے نسخہ نمبر ۱۰۴۵ کے کناروں پر لکھے ہوئے موجود ہیں۔ اس پر محشی کا نام حسب ذیل تحریر ہے:۔

"خیر المہندسین ابو الخیر منجم المخاطب بخیر اللہ خان ہندس"۔

اس نسخہ کی کتابت کا سال ۲ جمادی الاخری ۱۱۶۵ھ ہے (فہرست کتب خانہ مذکورہ جلد ۱۱ ص ۹۲) جو مصنف کی زندگی کا زمانہ ہے۔

۴۔ شرح زیج جدید محمد شاہی۔ راجہ جے سنگھ سوائی بانی جے پور و صوبہ دار آگرہ و مالوہ (المتوفی ۱۱۵۶ھ / ۱۷۴۳ء) نے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے حکم سے دہلی، جے پور، اجین، بنارس اور متھرا میں رصد خانے قائم کئے تھے اور جن کے بنانے میں علاوہ دوسرے ہندو مسلمان اور انگریز ہیئت دانوں کے یہ خیر اللہ ہندس بھی شریک تھا۔ ان رصد خانوں کی

تحقیقات خود راجہ کے نام سے زیج محمد شاہی کے عنوان سے ۱۱۴۰ھ میں تصنیف ہوئی تھی۔ خیر اللہ نے اس زیج کی ایک شرح لکھی جس میں جا بجا اس نے تشریحات اور استدلالات میں اپنے ذاتی مشاہدوں کا ذکر کیا ہے۔ اس شرح مذکور کا حوالہ علامہ غلام حسین جونپوری نے اپنی مشہور تصنیف جامع بہادر خانی میں دیا ہے۔

"مرزا خیر اللہ مہندس در شرح زیج محمد شاہی دعوی فرمودہ است کہ ما مدار خارج المرکز شمس بلکہ مدارات جمیع حوامل را بر شکل بیضوی یافتہ ایم"

۵۔ شرح زلالی و شرح حافظ و شرح سکندر نامہ۔ خیر اللہ کو اپنے خاندان کے موروثی جوہر سخن دری سے بھی حصہ ملا تھا۔ اس ذوق کا یہ اثر تھا کہ اس نے دیوان زلالی اور دیوان حافظ کی شرحیں لکھیں۔ ان شرحوں کا ذکر اس کے بیٹے نے تقریب التحریر کے دیباچہ میں کیا ہے۔

اسی قسم کی اس کی ایک اور کتاب سکندر نامہ کی شرح ہے۔ یہ دو جلدوں میں تمام ہوئی ہے اور عجیب تر یہ ہے کہ پرانے زمانہ میں وہ چھپ بھی چکی ہے۔ اس کی دوسری جلد جامعہ ملیہ دہلی کے کتب خانہ میں نظر سے گذری۔ یہ مطبع شرف المطابع دہلی میں ۱۲۶۸ھ میں طبع ہوئی تھی۔ اس پر مصنف کا نام و لقب "مرزا خیر اللہ خان مہندس خیر الشارحین" لکھا ہے۔

محمد علی ریاضی بن خیر اللہ مہندس:۔ خیر اللہ مہندس نے اپنی ایک جسمانی یادگار بھی چھوڑی جس کا نام محمد علی ہے۔ یہ بھی اپنے خاندان کے موروثی علوم ریاضی و ہیئت کا امانت دار تھا اور اسی لئے "الریاضی" کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس کے باپ نے اپنی کتاب تقریب التحریر مسودہ کی حالت میں چھوڑی تھی اور مبیضہ کا صرف دیباچہ لکھا تھا کہ وہ دوسری کتابوں کی تصنیف اور طلبہ کے درس و تدریس میں مصروف ہو گیا۔ محمد علی نے اس کتاب کو صاف

کر کے اشاعت و استفادہ کے قابل بنایا۔ چنانچہ اس کتاب پر خود محمد علی نے ایک دیباچہ بڑھایا ہے۔ جس میں یہ واقعہ درج کیا ہے:۔

"می گوید بندۂ خاکسار ذرۂ بے مقدار الراجی الی رحمۃ ربہ القوی، محمد علی الریاضی آنکہ چوں والداین احقر العباد بر تحریر اقلیدس شرحے مبسوط معنی کہ مسمی تحفۃ برائے تحریر است بزبانِ فارسی نوشتند . . . خواستند کہ بر تحریر کتاب مجسطی کہ مشکل ترین کتب علمِ ہیئت است، با براہین ہندسی و دریں رصد بے نظیرے کہ دستِ فکر ہر کس از ریاضی دانان بدامن مطلبش نمی تواند رسید و از دورِ خیال و ہر یکے از ہیئت دان لنگر معانیش نتوان جنبانید۔ نیز شرحے بزبانِ فارسی با فوائدِ دیگر بنویسند کہ برائے ہر طالبے بکار آید . . . در آخر سلطنت فردوس آرام گاہ محمد شاہ مسودہ آں تمام تحریر یافت۔ و بسبب بعضے از موانع کہ شغل مطالعۂ کتب دیگر باشد و عدم فراغ از دیگر امور مبیضہ آں در حیز تعویق افتاد الحال من بے بضاعت عاکف زاویۂ جہالت خصوصاً در علم ریاضی کہ دراں ریاضت معتدبہ نکردہ و آشنائے پیدا نساختہ و از پئے ریاض ریاضی نمودند، والد گرامی خواست کہ آں مسودہ را مبیضہ نویسد بحسب آنچہ در خاطر فاتر این ناقص درآید متن را . . . ."

اس کے بعد خیر اللہ کے مبیضہ کا دیباچہ ہے جو اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد محمد علی کی یہ عبارت ہے:۔

ومن مترجم مے گویم کہ ایں اخبار شارح بہ مبیضہ ساختن تا نوشتن دیباچہ بود و زیادہ اناں سبب بعضے از مشاغل اتفاق نیفتاد، چنانچہ ساختن شرح زلالی

"در شرحِ خواجہ حافظ و درسِ کتب ریاضی ایں حقیر فقیر خواست کہ تا ایں محنت ضائع نشود، جرأت در نوشتن بہ بیضہ نمود، والا چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک..."

محمد علی ریاضی، احمد معمار کے سلسلۂ نسل کی آخری کڑی ہے جس کا حال ہمیں معلوم ہو سکا ہے اور اسی نام پر اس خاندان کے تذکرہ کا خاتمہ ہوتا ہے جس نے کم از کم سوا سو برس لاہور اور دہلی میں تعمیرات و ہندسہ و ریاضی کی زندہ جاوید خدمتیں انجام دیں۔

اس تفصیل کے بعد ضرورت ہے کہ لطف اللہ مہندس کی اس مثنوی کو مسلسل یکجا نقل کر دیا جائے جس میں اس نے اپنے باپ اور بھائیوں کا اور خود اپنا حال لکھا ہے تاکہ اب ناظرین کو اس کی خاندانی حیثیت کے واضح ہو جانے کے بعد اس کی صداقت بیان کا پورا وثوق ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ تاج اور لال قلعہ کی عمارتوں کا اصل معمار اور مہندس کون تھا۔

شاہِ جہان داورِ گیتی ستان — روشنیِ دودۂ صاحب قران
عرشِ بریں قبۂ خرگاہِ اوست — رشکِ فلک سدۂ درگاہ اوست
احمدِ معمار کہ در فنِ خویش — صد قدم از اہلِ ہنر بود بیش
واقفِ تحریر و مقالاتِ آن — آگہِ اشکال و حوالاتِ آن
حالِ کواکب شدہ معلومِ او — سترِ مجسطی شدہ مفہومِ او
از طرفِ داورِ گیتی جناب — "نادرِ عصر" آمدہ اور اخطاب
بود عمارت گرِ آں بادشاہ — داشت دراں حضرتِ فرخندہ راہ
آگرہ چوں شد مضربِ رایاتِ شاہ — بس کہ بہ بد بود عنایاتِ شاہ
کرد بحکمِ شہِ کشور کشا — روضۂ ممتاز محل را بنا

باز بحکم شہ انجم سپاہ — شاہ جہان داور گیتی پناہ
قلعۂ دہلی کہ نہ دارد نظیر — کرد بنا احمد روشن ضمیر
این دو عمارت کہ بیان کردہ ایم — در صفتش خامہ روان کردہ ایم
یک ہنر از گنج ہنرہائے اوست — یک گہر از کان گہرہائے اوست
چون نبود عالم فانی مقر — کرد سوئے عالم باقی سفر
پس سہ پسر ماند زمرد سترگ — زان سہ عطاء اللہ رشیدی بزرگ
نادر عصر خود و مشہور شہر — عالم و علامۂ و دانائے دہر
مرد ہنر پرور و استاد فن — فاضل و دانشور و حبر زمن
مخزن علم آمدہ تالیف او — گنج ہنرہا ست تصانیف او
نثر وے از آب روان پاک تر — نظم خوشش غیرت سلک گہر
منکہ سخن پرور و دانش ورم — بندۂ آن حبر سخن پرورم
منکہ رہ بردم زجہان گوئے علم — از چمنش یافتہ ام بوئے علم
منکہ شدہ آگہ سر نہان — از دم او یافتہ ام قوت جان
ثانی آن ہر سہ برادر منم — ہندسہ یک فن بود از صد فنم
گرچہ مہندس لقبم از شہ است — نام من ول شدہ لطف اللہ است
ثالث آن ہر سہ برادر بسال — آمدہ "نور اللہ" صاحب کمال
ما ہمہ معمار و عمارت گریم — ما ہمہ استاد و سخن پروریم
لیک بود قصر کلامش عجب — زان شدہ معمار مرا و را لقب
گرچہ کم است سال وی از سال من — بیش بود حال وی از حال من

نثرِ وی از نظم گهربار تر	نظم ز نثر آمده هموار تر
دیده ز نورِ سخنش پُر ضیا	طبع ز لطفِ سخنش پر صفا
گنجِ هنر آمده در مشتِ او	هفت قلم رانده سه انگشتِ او
گرچه منم بے سخن استادِ فن	آن یکم و این یک بود استادِ من
گرچه مرا هست مهندس لقب
هندسه زان هر سه برآورد طلب

استاد احمد معمار کے خاندان کی ایک اور یادگار

زیب النساء بیگم کے دربار کی ایک اور تصنیف

شاہ اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی شہزادی زیب النساء بیگم کے علمی دربار کی جو یادگاریں اب تک معلوم تھیں۔ ان میں ایک اور تصنیف کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ استاد احمد معمار کے پوتے اور ہیئت کی مشہور درسی تصنیف تصریح شرح تشریح الافلاک کے مصنف ملا امام الدین ریاضی بن ملا لطف اللہ مہندس لاہوری کا معانی و بیان میں ایک رسالہ ہے جس کا نام بیانیہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ نواب سید علی حسن خان مرحوم (بھوپال ہوس لکھنؤ) کے کتب خانہ میں نظر سے گذرا۔

رسالہ کی زبان فارسی ہے اور اس میں اکثر عربی اور بعض فارسی اشعار سے مثالیں دی گئی ہیں۔ مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس نے اپنی طالب علمی میں یہ رسالہ لکھا تھا اور یونہی پڑا تھا جب اس کی خبر شہزادی کو معلوم ہوئی تو اس نے اس کو دربار میں پیش کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم کی تعمیل میں یہ رسالہ صاف کیا گیا۔

دیباچہ کی عبارت یہ ہے:۔

"حمد منزہے راسزد کہ ذات وصفاتش از مؤنت تشبیہ و تمثیل بے نیاز است
. . . . اما بعد چنیں گوید افقر عباد اللہ الغنی امام الدین الریاضی بن لطف اللہ
المہندس اللاہوری ثم الدہلوی کہ در خلال ازمنہ تحصیل و آونہ اکمال و تکمیل تو آ
چندکہ اساس علم بیان رفیع البنیان است تحریر نمود ولیکن بسبب اشتغال بعض
امور ماموره نقل آن از مسوده بمبیضہ بمقتضائے وقت نمی نمود ثانی الحال چوں
سنہ الف ومائۃ سبع ہجری مطابق سنہ سی جلوس امیر کبیر بسیار بخش کم پذیر
اورنگ زیب بہادر عالمگیر این معنی بعرض جناب عالمیان مآب بادشاہزادہ ذو القدر
الرفیع فیاض جہانیان ملکہ دوران حافظہ قرآن قرۃ العین خلیفۃ الرحمٰن نواب
قدسیہ القاب زیب النساء بیگم سلمہا اللہ تعالیٰ وابقی اظلال رافتہا علے
العالمین خصوصاً رسید، حکم جہان مطاع عالم مطیع شرف صدور و عز ورود
بخشید کہ آں را مرتب و مہذب بسازد تا بشرف مطالعہ لامعہ مطلع مشرق باشراقات
انوار الٰہی مشرف شود. فان وقع فی حیز القبول فھو منتھی المقصود
واقصی المامول، لھذا سمعاً وطاعۃ بانیان ایں امر و امتثال
ایں حکم پرداختہ مہذب و مدوّن ساختہ بہ بیانیہ موسوم نمود
اس نسخہ کی کتابت ۱۲۴۵ھ میں ہوئی ہے۔
مصنف کے الفاظ "بسبب اشتغال بعض امور ماموره" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو
کوئی بادشاہی عہدہ بھی ملا ہوا تھا۔

"س"

دیوانِ مہندس
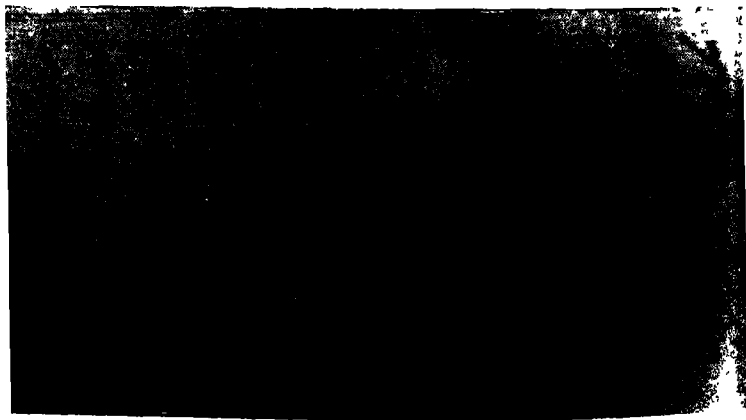
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خسرو مہر نشست بر اورنگ حمل — زُتمِ روز در اقلیم شب افگند خلل

رومیِ روز برافروختہ رایت بمصاف — زنگیِ شب سپر انداختہ ہنگامِ جدل

کیمیا ساز نبود است گر این عامل روز — مسِ شب را بزرِ روز چرا کردہ بدل

روز افزودہ و شب کاستہ زان روے کہ مہر — کردہ آئینۂ ایام و لیالی صیقل

سنگ از تربیتِ مہر شود لعل و کنون — اخگر از تربیتش لعل شود در منقل

وقت آنست کہ در قافلہ از فیضِ ہوا — آبِ زمزم شود اکنون نمی باب بدل

وقت آنست کہ واعظ چو نہد مجلسِ وعظ — صورتِ شیشہ شود نسخۂ واعظ بہ بغل

بس کہ انواعِ ریاحین ہمہ می پاشد عطر — گوشِ گل نشنود . . . . . .

در ورق ہائے گل امروز مفصل بینی — ہر چہ وے از دہن غنچہ شنیدی مجمل

گل کہ بر غنچہ زند خندہ مگر نشنیداست — از دہان بت من نکتۂ ماقل ودل

در چنیں موسم فرخندہ جہانے مشغول — بہ پیالہ بہ صراحی بہ ترانہ بہ غزل

من روم سوئے قدمگاہ تو اے سرور دیں — حاصل از خاک جنابت کنم امید و امل

گرچہ فی نسق نوشتی و نہ تعلیق و رقاع — از تو منسوخ شدہ نسخۂ ادیان و ملل

بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود — اے کف پائے تو تاج سر ارباب دول

سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود — ور دہد فیض تو جان سجدہ برد لات و ہبل

بوسم از روئے ادب خاک قدمگاہ ترا — تا شوم از مدد لطف تو مسعود ازل

از رہ بغض و حسد کور شود عین النور — گر فتد خاک قدمگاہ تو در چشم حجل

صورت پائے تو چوں شد شرف تارک خاک — رفت بر باد فنا صورت عزیٰ و ہبل

ہر دو پائے تو نہد تاج شرف بر سر دہر — ہر دو دست مہ و خورشید اگر گردد شل

قدم پاک تو اے سرورق دفتر دیں — از کف پنجۂ خورشید اعز است و اجل

گرچہ خورشید بلند است قدم بر خاک است — کے رسد مہر بجائے کہ قدم راست محل

نتواں گفت زحل را کہ بہ از خورشید است — گرچہ از نیر خورشید بلند است زحل

نتواں گفت کہ باشد ز اسد سرطان بہ — گرچہ باشد اسد از صورت سرطان اسفل

تبت از سورۂ اخلاص مقدم باشد — لیکن از سورۂ اخلاص نباشد افضل

اے مسیحا نفساں گردم جاں بخش شما — برسد سوئے عزیزان گذشتہ بمثل

انوری سر بدر آرد ز گریبان زمین — ہمچو گل ہا کفن پارہ سر از سبزۂ تل

آید از روئے طلب بس بدو زانوئے ادب — کند از فیض شما مشکل خود را ہمہ حل

عیب من نیست اگر گوہرِ اشعار مرا | نبود نزدِ درِ نظمم شما قدر و محل
زانکہ بے آب نماید گہرِ نظم پسند | نزد درہائے کلام صمد عزّ و جل
بر ہویداست کہ با معجزه ہمسر نشود | ساحرے گرچہ برون آورد اصناف و حِیَل
منم آں شاعرِ غرّا کہ بانگشت ضمیر | حل توانم کہ کنم عقدۂ ما لاینحل

گرچہ من ساحرم ایں سحر حلال است حرام | کہ بنازند تلامیذِ خدا نزد دغل
دل دانائے مرا فخر بعلم است و بفضل | جاہل است آنکہ بنازد بحلی و بحلل
باش بلطف اللہ احمد چہ کنی فخر بعلم | جہل ازیں علم تو بہتر کہ نباید بعمل
اے ہنر کردہ عیاں ہمچو قدح برکفِ دست | عیب ہا کردہ نہاں ہمچو صراحی بہ بغل
عمر در درس بسر بردی و در آخرِ کار | ہیچ حاصل نشد از مدرسہ جز بحث و جدل
رنج در شعر کشیدی و نگفتی بسزا | نہ رباعی نہ خماسی نہ قصیدہ نہ غزل

زاب چشم تر خود دفتر اشعار بشوی
عاقبت خیر طلب کن ز خدائے عزّ و جل

بیار بادہ کہ جرمم عنایتِ باری | قلیل می‌شمرد با وجودِ بسیاری
بیار بادہ کہ از جورِ آسمانِ بخیل | بہ یُمنِ بادہ بیاسایم از جگرخواری
بیار بادہ کہ بارِ گرانست بر دل من | مگو شراب شود مایۂ سبکباری
بیار بادہ کہ فرض است در شریعتِ عشق | ز مکتبِ خرد و درسِ عقل بیزاری
بیار بادۂ رنگین کہ طبع رنگینم | ز فیضِ بادہ طلب مے کند مددگاری

بیار بادہ کہ مستی است آرزوئے دلم　　ملول گشتہ ام از شیوہ ہائے ہشیاری

نہ حاکمم کہ بود کارِ من حکومتِ شہر　　نہ محتشم کہ بود طرزِ من علمداری

نہ شحنہ ام کہ گنہگار را کنم تنبیہ　　نہ محتسب کہ کنم خلق را دل آزاری

نہ شاعرم کہ در آرم سخن برشتۂ نظم　　نہ منشیم کہ دہم دادِ دل بہ نثاری

نیم حکیم کہ گویم ز علت و معلول　　نیم طبیب کہ دانم علاجِ بیماری

نیم ادیب کہ اطفال را کنم تعلیم　　نیم فقیہ کہ بخشم قضات را یاری

نہ گازرم کہ کنم جامہائے مردم پاک　　نہ درزیم کہ بدوزم قبالطبتاری

نہ مِس گرم کہ کنم طشت و آفتابہ ز مِس　　نہ زرگرم کہ بدزدم طلا بعیّاری

اگرچہ نیستم از نوعِ ایں ہنرمنداں　　ولے زجنسِ ہنر مطلقاً نیم عاری

ہندسیم کہ کنم صورتِ فلک تصویر　　کشم بروئے زمین گر خطوطِ پرکاری

چناں بلند نہادم اساسِ قصرِ خرد　　کہ بر سپہر زنم طعنۂ نگوں ساری

چناں منیر شود شستۂ عمارتِ من　　کہ نورِ مہر بود نزدِ نورِ او تاری

دمے کہ من بعمارت گری شوم مشغول　　ملک مصالحِ کار آورد بسرباری

بدستیاریٔ لطفِ شہِ بلند اقبال　　بلند پایہ زمن گشت قدرِ معماری

سپہرِ مرتبہ دارا شکوہِ دریادل　　کہ ہمچو ابر کفش مے کند گہرباری

اگر بہ بزم در آید بدستمر شود ساغر　　دگر بہ رزم بر آید فلک کند یاری

زہیبتش نتواں یافت نیم قطرۂ خوں　　ہزار بار دلِ خصمش ار بیفشاری

بزخمِ تیر کہ زد در دلِ معاندِ او　　ربودہ زنگِ دلم را سپہرِ زنگاری

شہا چو صف کشی از بہرِ فتح روئے زمین　　فلک دہد بظفر منصبِ علمداری

بعهدِ دولتِ تو راجه هائے کوهستان — ز فرقِ خویش نهاده کلاهِ جباری
بیک نگاه که کردی بسوئے کوهستان — گرفته پست و بلندیِ کوه همواری
بمهرِ چرخ فلک بنگرد اگرچه کند — چو چرخ آب حسودِ تو گریه و زاری
دران دیار که بختِ حسودِ تست بخواب — ندیده دیدهٔ مردم بخوابِ بیداری
روان بحکمِ تو هم خاکی است و هم آبی — دوان بامرِ تو هم بادی است و هم بادی
وگر رسد بفلک صیتِ امرِ نافذِ تو — براوجِ چرخ تو آیت کنند سیاری
بدورِ عدلِ تو جز چشمِ مستِ محبوبان — کرا مجال که بیند بقصدِ خونخواری
شها اگرچه عمارت گرسیت پیشهٔ من — وگرچه نیست ضمیرم ازین هنر عاری
کنون که ملکِ دلم شد خرابِ عشقِ بتان — تو خود بگو که چه نسبت مرا بمعماری
ولے مجال نباشد که کس عدول کند — ز حکمِ شه که بر بحر و بر بود جاری
خموش باش مهندس سعادتِ ازلی — دران بود که بجان حکمِ شه بجا آری
ترا چه قدرت و یارا که دم زنے ز هنر — اگر نه لطفِ شهنشه کند مددگاری
دعائے دولتِ شه کن برآر دست بیار — که دیده سوئے تو دارد اجابتِ باری
همیشه تا غم و شادی بود بروئے زمین — نتیجهٔ حرکاتِ سپهرِ زنگاری

مدام باد هواخواهِ دولتِ تو بعیش
نصیبِ خصمِ تو جاوید باد خونخواری

روئے تو خورشیدِ تابان منست — مهرِ تو پیوسته در جانِ منست
دردمندم دردمندم دردمند — دیدنِ روئے تو درمانِ منست

گریۂ دارم کہ صد طوفانِ نوح　　قطرۂ از بحرِ عمّانِ منست
گر جمالت در نظر باشد مرا　　گلخنِ دوزخ گلستانِ منست
ورنہ بینم چہرۂ زیبائے تو　　گلشنِ فردوس زندانِ منست
تا ترا در کلبۂ من شد نزول　　آیتِ حسنِ تو در شانِ منست
صد ہنر دارم منِ بیدار دل　　بختِ خواب آلودہ برہانِ منست
آسماں با ایں ہمہ قدرِ رفیع　　کاسۂ در طاقِ نسیانِ منست
در چمن صد عندلیبِ نغمہ گر　　گوش بر آوازِ دستانِ منست
گرچہ فیضیؔ نغمہائے نغز داشت　　عندلیبے از گلستانِ منست
گرچہ عرفیؔ بحرِ گوہر خیز بود　　قطرۂ از بحرِ طوفانِ منست
گرچہ طالبؔ داشت اشعارِ ملیح　　سکتۂ در بیتِ دیوانِ منست
گرچہ شیداؔ خوانِ معنی چیدہ بود　　ریزہ چینِ خوانِ احسانِ منست
گرچہ رنگین بود اشعارِ منیرؔ　　سادہ لوحے در دبستانِ منست
نامۂ من بحرِ گوہر خیزِ من　　خامۂ من ابرِ نیسانِ منست
خامۂ من بس کہ مے ریزد گہر　　نامۂ من بحرِ عمانِ منست
دانش و بینش دُرِ دریائے من　　عقلِ اوّل گوہرِ کانِ منست
ایں ہمہ دولت کہ می گویم مرا　　از عنایت ہائے سلطانِ منست
آں سلیمانے کہ گوید بے سخن　　بحر و بر در زیرِ فرمانِ منست
بزمِ او گوید کہ ماہ و آفتاب　　پرتوِ شمعِ شبستانِ منست
قصرِ او گوید کہ روزِ بارِ عام　　قیصر و فغفور دربانِ منست

جودِ او گوید کہ حاتم صبح و شام
ریزہ چینِ خوانِ احسانِ منست

تیرِ او گوید کہ ضیغم بر فلک
چوں تنیں مجروحِ پیکانِ منست

دستِ او گوید کہ ہنگامِ نشاط
فرقِ دشمن گوئے چوگانِ منست

دل از ہجر زار است اللہ اکبر
چہ زار و نزار است اللہ اکبر

بجائے کہ رفتن و مسکن گزیدی
چہ دار و دیار ست اللہ اکبر

زحبیب کنارت کسب تو کار
چہ حبیب و کنار ست اللہ اکبر

خطت مشک از فرخت مہر انور
چہ لیل و نہار است اللہ اکبر

پری رو ملک خو، سہی قد، سمن بر
چہ زیبا نگار است اللہ اکبر

کمانِ تو ابرو و تیرِ تو مژگان
چہ عزم شکار است اللہ اکبر

غمت را بجان و دلِ دردمندان
چہ قرب و جوار است اللہ اکبر

ز جورِ رقیباں بر آئینۂ دل
چہ گرد و غبار است اللہ اکبر

زدم بر سرِ سنگ مینائے خالی
چہ رنج خمار است اللہ اکبر

زرِ خالصِ ما کہ ناقص مبادا
چہ کامل عیار است اللہ اکبر

ملک باشد از نور شیطاں ز آتش
چہ نور و چہ نار است اللہ اکبر

خیالات دنیائے موہوم فانی
چہ بے اعتبار است اللہ اکبر

ولے نفسِ امارہ در جذبِ شہوت
چہ بے اختیار است اللہ اکبر

غزلیں

اے قاصر از کمال تو اندیشہائے ما | کے در خورِ کمال تو باشد ثنائے ما
از روئے التفات خطاہائے ما بپوش | یا رب کہ پوشدار تو نپوشی خطائے ما
روزے کہ زیں سرا بسرائے دگر روم | بفرست خوان رحمت خود در خفائے ما
چوں ہمچو مصطفےٰ است شفاعت گرے چہ ڈر | مقرون اگر شود باجابت دعائے ما

زیں پس برہبریٔ مہندس چہ حاجت است
چوں ہست پیشوائے رسل رہنمائے ما

التفاتِ یار مے خواہیم ما | جلوۂ دلدار مے خواہیم ما
کامِ ما از زہر ہجراں تلخ شد | لعل شکر بار مے خواہیم ما
تا دلِ ما آشنائے آں بت است | رشتۂ زنار مے خواہیم ما
کار کن گفتار کے آید بکار | ترک ایں گفتار مے خواہیم ما

در دمِ آخر مہندس چوں حباب
دیدۂ بیدار مے خواہیم ما

یا بلبل زار در چمن ها　　دارم ز زبان گل سخن ها
رازے کہ رسد بگوشِ مردم　　سر بر زند آخر از دہن ها
صد بار زدیم شانہ بر زلف　　دل ماند گرہ دران شکن ها
از بہرِ نظارۂ تو مردم　　گشتند مسافر از وطن ها

در حلقۂ ابلہان مہندسؔ
بازیست نشستہ در زغن ها

الا ایہا الساقی خدا را　　بجام بادہ خوش کن وقتِ ما را
ز قدرِ بادشاہاں کم نگردد　　بیفزائید گر قدرِ گدا را
صبا بوئے گل اندامے نیاورد　　خداوندا چہ پیش آمد صبا را
مسیحا از سرِ بالینِ من خیز　　کہ دردِ من بود دشمن دوا را

مہندسؔ گرچہ آگہ بود زین پیش
فرامش کرد قانونِ شفا را

چوں شمع تو بنیاد کند جلوہ گری را　　پروانہ زمن کسب کند جان سپری را
با موئے تو ہمسر نشود عنبر سارا　　با روئے تو نسبت نبود روئے پری را
از قدِ تو آموختہ اے سرو سمن بوئے　　در باغِ عروسانِ چمن جلوہ گری را
مارا خبرے زاں گلِ رعنا نرسانید　　امروز چہ پیش آمدہ بادِ سحری را

خواہم کہ کشم بادہ چوں لطف اللہ احمد
تا چند کشم محنت دورِ قمری را

روئے آں ماہ دیدنم ہوس است — گل آن باغ چیدنم ہوس است
بہ امید عنایتِ دلبر — طمع از دل بریدنم ہوس است
از گریبان گرفتہ تا دامن — جامہ چوں گل دریدنم ہوس است
سخن و رنگ بوئے گل یک دم — از ہزاراں شنیدنم ہوس است
چوں مہندس کنم سحر خیزی
کہ بمنزل رسیدنم ہوس است

در تو اے غنچہ امروز صفائی دگر است — در تو مطرب امروز نوائے دگر است
گاہ در گوشۂ ابرو گہے در خمِ زلف — دل سودا زدہ ہر لحظہ بجائے دگر است
از پئے بندِ من آن زلفِ بلائیست قوی — وز پئے قتل من آں غمزہ بلائے دگر است
دلِ ریشم شود بہ۔ بمداوائے کلیم — کہ شفائے دلِ عاشق ز دوائے دگر است
گرچہ قانونِ شفا کس چوں مہندس نشناخت
لیک فصدِ دلِ عشاق بجائے دگر است

پیوستہ لب تو انگبین است — ہموارہ بر تو یاسمین است
ہاروت تو خنجر جہاں سوز — یاقوت تو با شکر عجین است
چشم تو بہ غمزہ ہم زبان ست — زلف تو بفتنہ ہمنشین است
با لعل تو کے شود برابر — شعر من اگرچہ انگبین است
در عشق تو طے کند مہندس
راہے کہ بروں ز کفر و دین است

بادرِ تو هر که هم‌نشین است — چون من دل و جان او حزین است
از خرمنِ آفتابِ حسنت — آئینهٔ ماه خوشه‌چین است
مو نیست میانِ سخن‌وران نیست — مو نیست دهن سخن درین است
واعظ منشین به بزمِ عشاق — وعظِ تو اگرچه دل‌نشین است
باشد ز فلک مهندس آگاه
با آنکه نشسته بر زمین است

دل با غمِ دوست هم‌نشین است — شادی است که دل بغم قرین است
هر لحظه شود پُر اشک دامن — این گریه مگر در آستین است
من تشنه و زهر در پیاله — من غافل و خصم در کمین است
گه نوش بود نصیب گه نیش — تا هست زمانه این چنین است
افسانهٔ وصلِ او مهندس
آسایشِ خاطرِ حزین است

بوی تو هم‌نشینِ یاسمین است — لبِ تو هم زبانِ انگبین است
دو هاروتِ تو با خنجر معاً دل — دو یاقوتِ تو با شکر عجین است
مرا محبوبِ چینی هست در بر — چه حاجت بر درِ فغفورِ چین است
کند نام مرا نقشِ نگین مهر — مرا تا نامِ او نقشِ نگین است
بهفتاد و دو ملت صلح دارد
نمیدانم مهندس را چه دین است

نے مرا کفر نے مرا دین است — چہ کنم سرنوشت من این است
گاہ در دیر و گاہ در مسجد — ایں چہ دین است و این چہ آئین است
نہ ہم دل بخانۂ مردم — گرچہ من طفل و خانہ رنگین است
زاں پسندید شعر من خسرو — کہ سخن چوں لب تو شیرین است
تا ہندسؔ دعائے وصل تو خواند
بر زبانِ ملائک آمین است

قد تو سروِ گلشنِ جان است — رُو نمائے تو صد گلستان است
در فراقِ تو اے دُرِ یکتا — چشمِ مردم چوں بحرِ عمان است
از فسونِ تو دیدۂ مردم — اے پری صبح و شام گریان است
دُرِ اشکم ببین و گوہرِ نظم — چشمِ من بحر و طبعِ من کان است
تا ہندسؔ جدا شُد از درِ تو
دیدہ گریان و سینہ بریان است

بے تو ما را در چمن گلہائے حمرا آتش است — زانکہ وامق را چمن بے روئے عذرا آتش است
گر در آغوش است دلبر بوریا اطلس بود — ور نباشد یار در بر فرشِ دیبا آتش است
راست گویم سروِ یوسف گر نباشد در کنار — گلشنِ فردوس در چشمِ زلیخا آتش است
گر نباشد طلعتِ زیبائے جاناں در بہشت — حوض کوثر نہر جاری نخلِ طوبیٰ آتش است
اے مہِ بے مہر در چشمِ ہندسؔ بے رُخت
از حضیضِ خاک تا اوجِ ثریا آتش است

تا زدستت در دلِ سودائیِ ما آتش است — در بدن از موئے سر تا ناخنِ پا آتش است

خوئے تو با دیگراں عیسیٰ است با ما تیغ تیز — روئے تو با دیگراں فردوس با ما آتش است

می زند در سینۂ ما نیش ہر جا عقرب است — می نہد در خرمنِ ما شعلہ ہر جا آتش است

بس کہ دارد آتشِ عشقِ تو تاثیرِ عموم — آشنایانِ ترا در عینِ دریا آتش است

خاص مے داند مہندس قدرِ نورِ طور را

وز خیالِ عام نورِ طورِ موسیٰ آتش است

توبہ در نو بہار بے معنی است — ترکِ مے در خمار بے معنی است

مردمان را برائے دیدنِ تو — ایں ہمہ انتظار بے معنی است

گر بقتلم نہ دہی فتوے — خال و خط بر عذار بے معنی است

گر تو دعوائے عاشقی داری — شرمِ خویش و تبار بے معنی است

زد مہندس بعلم یک دو سہ شکل

ایں ہمہ افتخار بے معنی است

گل و باغباں را بباغ است نسبت — من و بادہ را با ایاغ است نسبت

زفیضِ دماغم دل و دیدہ روشن — دل و دیدہ را با دماغ است نسبت

چہ شہدم چشد کو بزہر است مائل — ز باغم رود کش بداغ است نسبت

چہ محمود را با ایاز است الفت — چہ پروانہ را با چراغ است نسبت

مہندس ترا با کتاب است الفت

منِ مست را با ایاغ است نسبت

شکر کایام غمم آخر شد و رفت — روزگار الم آخر شد و رفت
بر منِ خسته دل از دستِ رقیب — آں جفا و ستم آخر شد و رفت
ساقیا جامِ مے از دست مده — زانکه دورانِ جم آخر شد و رفت
سوزِ پروانه و بیدادیِ شمع — همه در صبحدم آخر شد و رفت

از مهندس نرود گنج هنر
گرچه گنجِ درم آخر شد و رفت

دولتِ آلِ طغے آخر شد و رفت — ملک کاؤس و کے آخر شد و رفت
که دریں بزم مے عشرت خورد — که نه دورانِ وے آخر شد و رفت
کس ندانست که ایامِ شباب — کے شد آغاز و کے آخر شد و رفت
زاں ملولم که زبازیِ فلک — عهدِ فرخنده پے آخر شد و رفت

از مهندس نرود گرمیِ مے
گرچه میناے مے آخر شد و رفت

در سرِ ما جز خیالِ یار نیست — در دلِ ما جز غمش را بار نیست
هر که خواهد گو بیاید بے حجاب — خلوتِ ما را در و دیوار نیست
یافت عیسیٰ سروری از پائے دار — دستگیرِ عارفاں جز دار نیست
بارها سیرِ چمن کردم ولے — بارِ گل بر گوشهٔ دستار نیست

اے مهندس زد که در علمِ نظر
احتیاجِ مسطر و پرکار نیست

جز تو اصحابِ طرب را طور نیست ‌ ‌ ‌ ‌ بے نوا ارباب نظر را نور نیست
شیخِ صنعاں را خدا گمراہ کرد ‌ ‌ ‌ ‌ گر مرا گمراہ سازد دور نیست
محرمِ رازِ نہاں ہستم ولے ‌ ‌ ‌ ‌ گفتنِ رازِ نہاں دستور نیست
آں زماں یک دار و عند منصور بود ‌ ‌ ‌ ‌ ایں زماں صد دار و یک منصور نیست

ہاں ھندس بگذر از برہانِ خویش
نزد ما برہانِ تو منظور نیست

تا روے تو دیدیم نظر بردگرے نیست ‌ ‌ ‌ ‌ تا از تو خبر یافتم از خود خبرے نیست
اے باد نیاری خبرے زاں گلِ رعنا ‌ ‌ ‌ ‌ شاید کہ ترا سوئے گلستاں گزرے نیست
ہر چند بود سیم و زر افزوں الم افزوں ‌ ‌ ‌ ‌ مفلس تو خوشی زانکہ ترا سیم و زرے نیست
باید کہ تو گامے نزنی جز بتامل ‌ ‌ ‌ ‌ ہر چند کہ گویند دریں رہ خطرے نیست

باآنکہ ہمہ لاف و گزاف است ھندس
دیدیم ز سر تا قدمِ او ہنرے نیست

از تو بر عاشقِ مسکین ستمے نیست کہ نیست ‌ ‌ ‌ ‌ بے تو در خاطرِ غمگین المے نیست کہ نیست
بلبلِ دل شدہ را از پئے بوئے گلِ خویش ‌ ‌ ‌ ‌ ہمزبانے بصبا صبحدمے نیست کہ نیست
درخمِ زلفِ کسے بند نگردد دلِ ما ‌ ‌ ‌ ‌ ورنہ در زلفِ تو اے شوخ خمے نیست کہ نیست
بہرِ ناں زاہد اگر زہد فروشد چہ عجب ‌ ‌ ‌ ‌ زانکہ در طالبِ نانے شکمے نیست کہ نیست

گو ھندس ننویسد زپئ من رقمے
زانکہ در لوحِ ضمیرم رقمے نیست کہ نیست

باغیر نمے کنم حکایت | از دوست نمی برم شکایت
از حضرت دوست سر نتابم | گر قتل کند وگر حمایت
پا در رہ مے کدہ نہم چست | گر پیر مغاں کند ہدایت
در مذہب عاشقاں نباشد | از مالک و شافعی روایت

ہاں حرفِ زمیں بگو مہندس
تا کے ز فلک کنی حکایت

از دل ما دلبر گلچین بارے برنداشت | وز رہ ما مہبر بے مہر خارے برنداشت
تا نہ بہرِ قتلِ من شمشیر براں تیز کرد | سبزہ سر از کنار جو ئبارے برنداشت
ز آستین دست قضا بیروں نیامد تا بجز | ابلقے از پا نیفگند و حمارے برنداشت
چوں زند طعنِ تہی دستی سبک مزار خوار | گاہ فتراکِ سمندم گر شکارے برنداشت

ہاں مہندس کے بود تاجِ تصوف بر سرش
آنکہ کفشِ صوفیٔ کامل عیارے برنداشت

از عشوہ ہائے غمزۂ ترکانہ الغیاث | وز غمزہ ہائے نرگسِ مستانہ الغیاث
چشمم بعشق گوہر یکدانہ بحر شد | یا رب ز عشقِ گوہر یکدانہ الغیاث
دریاست چشمِ من ز ستم ہائے آشنا | تا کے کنم ز مردمِ بیگانہ الغیاث
زانکہ کہ بت پرستی بت خانہ میکنم | دارد ز دست من بت و بتخانہ الغیاث

آنجا کہ عشق شعلہ زند عقل خس بود
دارد مہندس از کفِ دیوانہ الغیاث

میدمد رنج این زمانه زین زمانه الغیاث — می برد صبر این ترانه زین ترانه الغیاث

بهرِ آب و دانه در دام آمدی اے عندلیب — دام را جرمے نباشد ز آب و دانه الغیاث

تا صبا و شانه زلفت را مشوش میکند — از صبا فریاد دارد دل ز شانه الغیاث

یار را گفتم مرادِ خاطرِ یاران بر آر — میکند هر دم بهانه زین بهانه الغیاث

دمبدم کوته شود سر رشتهٔ عمر از زمان

زان مهندس دارد از دستِ زمانه الغیاث

اے لبت از نبات خواسته باج — چینِ زلفت ز چین گرفته خراج

در سوادِ دو زلفِ چهرهٔ تو — همچو ماهِ منیر در شبِ داج

خوئے تو، طبعِ من چو آتش و آن — هجرِ تو، صبرِ من چو سنگِ زجاج

گر بکویت رسم طواف کنم — گرد کویت چو گردِ کعبه حجاج

در شبِ وصلِ تو مهندس را

هم شبِ قدر و هم شبِ معراج

وا رسے منت شربتِ دیدار دگر هیچ — وصلِ تو علاجِ منِ بیمار، دگر هیچ

در کوے تو گر راه بود اے مہِ بے مهر — کافی ست مرا سایهٔ دیوار، دگر هیچ

هر گاه مرا برد سوئے میکده ساقی — دادم به گرو خرقه و دستار، دگر هیچ

اے بادِ صبا گر سوے گلزار بری پے — جز قصهٔ بلبل مکن اظهار، دگر هیچ

کے شیوهٔ کردار بود در تو مهندس

کاموخته شیوهٔ گفتار، دگر هیچ!

ماہِ من گر دہد صلائے قدح　　دل و جاں را کنم فدائے قدح
جانِ من باد بندۂ مینا　　سرِ من باد خاکپائے قدح
ہر کہ آگہ بود ز دورِ فلک　　مدحِ مینا کند ثنائے قدح
ساقیا چوں حباب تا دمِ نزع　　در سرِ من بود ہوائے قدح
ہاں مہندس دلے بدست آور
کہ ستانند رونمائے قدح

بود در سرِ من ہوائے قدح　　سرِ من بود خاکپائے قدح
اگر ساقئ من قدح پر کند　　دل و جاں وہم رونمائے قدح
مکن تا دمِ واپسیں چوں حباب　　برد از سرِ خود ہوائے قدح
دریں دور دردِ تو باید مدام　　دعائے صراحی ثنائے قدح
مہندس کواکب بباید بکار
مہ و مہر را کن فدائے قدح

اے شدہ تختہ بندِ منظر و کاخ　　تنگدل گشتہ در جہانِ فراخ
او سفر کن کہ کس نیابد کام　　تا بود تختہ بندِ منظر و کاخ
کے شوی آشنائے خلوتِ گل　　اے چو بلبل نشستہ شاخ و شاخ
دیدہ بردار کن چو نرگسِ مست　　یا ببیں سوئے روئے گل گستاخ
صرف بیہودہ شد مہندس عمر
میکنم صبح و شام آوخ و آوخ

شد آہوئے دل شکارِ آں شوخ — حیراں شدہ ام از کارِ آں شوخ
کردم دل و دین نثار اکنوں — جاں نیز کنم نثارِ آں شوخ
دلداریٔ من نکرد تا کے — باشد دل من فگارِ آں شوخ
رفتم بہ چمن صبا برآورد — بوئے خطِ مشکبارِ آں شوخ
دارد خبر از جہاں مہندس
اِلّا خبر از دیارِ آں شوخ

روئے او مقصد است و او مقصود — کوئے او معبد است و او معبود
شد بشمعِ جمالِ او روشن — خلوتِ ہر کہ بود خواہد بود
اگر آں رہ روم و گر ایں راہ — نبود جز وصالِ او مقصود
روزِ اوّل ایاز خواستہ بود — کہ مرا باد عاقبت محمود
از مہندس مپرس سرِّ فلک
کین معمار ہیچکس نکشود

یاراں ہلالِ عید برآمد نظر کنید — ماہِ صیام رفت مغاں را خبر کنید
یاراں دگر بگوریٔ مفتی و محتسب — امروز خاکِ میکدہ کحلِ بصر کنید
آنکس کہ از برآمدنِ مہ خبر کیند — او را بہ احترام دہن پُر شکر کنید
اکنوں رسید کوکبۂ عیش انبساط — اے درد و غم ز مملکتِ دل سفر کنید
گر در من و نگار مہندس شود حجاب
دستش گرفتہ زود ز محفل بدر کنید

تا دل بقناعت آشنا شد   در کشورِ فخر بادشا شد
بر کون و مکاں نظر ندارد   چشمے کہ بجانبِ تو وا شد
آنجا کہ تو عزمِ جلوہ داری   نقدِ مہ و مہر رو نما شد
چوں نورِ تو شد محیطِ اشیا   خورشید خفی تر از سہا شد
از دولتِ ہندسہ مہندس
با بحرِ محیط آشنا شد

تا دل بہ غمِ تو مبتلا شد   بیگانہ ز خویش و آشنا شد
ہر درد کہ تا شب آمدہ بود   از روزِ ازل نصیبِ ما شد
روئے تو کہ راحتِ دل و جاں ست   بہرِ دل و جانِ ما بلا شد
دردے کہ درونِ دل نہاں بود   از شومیٔ اشک برملا شد
زار است مہندس از غمِ عشق
بر دین و دلش دگر چہ ہا شد

مے لبم را آشنائے جام کرد   مے مرا رسوائے خاص و عام کرد
روئے رنگینان شامِ ما را صبح ساخت   موئے مشکین صبحِ ما را شام کرد
ماہ نور از روئے تاباں قرض خواست   مشکِ بوئے از زلفِ جاناں وام کرد
خالِ مشکینِ بتاں را دار ساخت   آنکہ زلفِ عنبریں را دام کرد
سرِ پنہاں را چو خود کرد آشکار
پس مہندس را چرا بدنام کرد

یاد باد آں حسن و آں رو یاد باد — یاد باد آں زلف و آں مو یاد باد
یاد باد آں گفتگوئے لعلِ دوست — واں اشارتہائے ابرو یاد باد
یاد باد آں غمزۂ خونخوارِ او — واں فریبِ چشمِ جادو یاد باد
یاد باد آں زلفِ عنبر بارِ او — واں نسیمِ جعدِ گیسو یاد باد
ہاں مہندس یاد آں دارد و بار
طوفِ آں در سیرِ آں کو یاد باد

شبے مرا آں بتِ نوخاستہ در منزل بود — ہر مرادے کہ دلم خواست ازو حاصل بود
شاہِ ترکانِ خطا خسروِ خوبانِ چگل — با گدایانِ خرابات نشیں خوشدل بود
ایکہ پروانۂ شمعِ رخِ او ماہ سزد — ہمہ شب تا بسحر روشنیٔ محفل بود
آستیں برزد و شمشیر بر آورد و مرا — فکر آلودگیٔ دامنِ آں قاتل بود
زاں مہندس ہمہ شب خون دل از برات
کہ ز شمشیر نگاہت دلِ او بسمل بود

دی کہ صد برگ براں چیدم و خوشدل بود — ایں نہ دانست کہ آں دولتِ مستعجل بود
برمنِ ہیچمداں کشف شد از فیضِ ازل — راز سر بستہ کہ بر ہندسہ داں مشکل بود
صرف در منطق و حکمت شدہ ایں عمرِ عزیز — لیکن آں نکتہ نخواندم کہ درو حاصل بود
جز مے و مطرب و معشوق و دف و چنگ و رباب — ما ہر اندیشہ کہ کردیم ہمہ باطل بود
برقِ فیضِ ازلی بر دلِ بیداراں تافت
حیف صد حیف مہندس ہمہ شب غافل بود

دی بادِ صبا بوئے چمن سوئے من آورد — امروز مرا بادِ صبا در چمن آورد
در فصلِ خزاں بود لبم بستہ درین فصل — نظارۂ گل باز مرا در سخن آورد
در بزمِ تو با بوالہوساں ست برابر — پروانہ کہ پروانگیٔ سوختن آورد
پروانہ صفت باش کہ از رہ گذرِ شوق — ہمراہ خود از بال و پرِ خود کفن آورد
خاکِ قدمش کحلِ بصر ساخت دہندتیؔ
قاصد خبرِ وصل مگر سوئے من آورد

صد شب دردِ دل کوفت کہ یک شب سحر آورد — صد کس پئے او رفت کہ یک کس خبر آورد
تا در بدنش جانست نخواہد کہ برآرد — شخصے کہ دل اندر خم آں زلف درآورد
شاید کہ لبِ من کند از لعل تو شیریں — ایزد کہ شبِ ہجر تو اے بُت بسر آورد
عمریست کہ وصلِ تو نمی گشت میسّر — آہِ سحر و نالۂ شب کار بر آورد
یک لحظہ دہندتیؔ ز غمِ ہجر نیاسود
صد شکر شبِ ہجرِ تو رو در سحر آورد

گلرخانِ سروِ قد چوں شانہ بر سر میکنند — ہمچو کاکل روزگارِ عاشق ابتر میکنند
پادشاہانِ در پئے تسخیرِ ملکِ آبِ گل — خوبرویاں کشورِ دل را مسخّر میکنند
اہلِ صورت گرچہ بر روئے زمیں رانند حکم — اہلِ معنی حکم بر افلاک و اختر میکنند
کاش کہ از گوشۂ چشمے نظر برما کنند — آں نظربازاں کہ خشتِ خام را زر میکنند
چوں دہندتیؔ ہر کہ وصفے کرد نامش زندہ باد
ہر سحر نوبت نوازاں یادِ سنجر مے کنند

ساقیا چوں بادهٔ صافی بساغر می کنند — دیدهٔ مردم بنورِ مے منوّر میکنند
. . . . بر نتابد آسمانِ معرفت — اہل وحدة طعنه بر شکل دو پیکر میکنند
عاقلاں کردند صد معنی او در یک سخن — ابلہاں یکحرف را ہفتاد دفتر میکنند
تا نمی بینند مردم چہرهٔ زیبائے دوست — دیده را چوں بحرِ عماں پر ز گوہر میکنند

زاں مہندس را محبت نیست با اربابِ بد
کین جماعت طعنه بر اصحابِ ساغر میکنند

پری روئے کہ بر رویش پری دیوانه میگردد — بگردِ شمعِ رویش شمع چوں پروانه میگردد
اگر با لعلِ میگونش ندارد نسبتے بادہ — چرا ساغر دریں محفل چنیں مستانه میگردد
اگر با چشمِ لیلیٰ نیست نسبت ایں غزالاں را — چرا مجنوں دریں صحرا چنیں دیوانه میگردد
دلم کز بہرِ طوفش کعبه می آید ز صد منزل — نمیدانم چرا در گردِ ایں بت خانه میگردد

مہندس تا به بحرِ عشقِ آں بت آشنا گشتم
ز فیضش قطره ہائے اشکِ من دُردانه میگردد

بتِ من در دلِ من بہرِ خود کاشانه می سازد — نمیدانم چرا در آب و آتش خانه می سازد
دلِ ویران ما را وصلِ او آباد میدارد — دلِ آباد ما را ہجرِ او ویرانه می سازد
گر افلاطونِ عہدی و ارسطوئے زماں ہستی — اگر با من نشینی صحبتم دیوانه می سازد
بخویش و آشنا الفت ندارد عاشقِ مسکیں — که عشقِ تو ز خویش و آشنا بیگانه می سازد

مہندس دست از ایماں بشو کیں نفسِ امّاره
بیک ساعت مہیا صد بت و بتخانه می سازد

هر که خواهد کامیاب از چشمهٔ کوثر شود　　بندهٔ بو بکرؓ و خاکِ درگہِ حیدرؓ شود

گرچه من در خاکِ فنوں افتاده ام اکنوں ولے　　عزتم خواهی که بینی باش تا محشر شود

اینکه من امروز دارم گریه فردا روزِ حشر　　بهرِ تاجِ عزتم هر قطرهٔ گوهر شود

بر دل و بر جانِ من هر لحظه غمها می رسد　　شرحِ یک غم گر کنم تحریر صد دفتر شود

هاں مهندس بندهٔ شاهِ بلند اقبال باش

آنکه فرمان گر دهد جمشید فرمان بر شود

یارِ ما گر خاک را در دست گیرد زر شود　　ما اگر زر را بدست آریم خاکستر شود

در خمِ زلفش بود جمعیتِ دلهائے ما　　کارِ ما ابتر شود گر زلفِ او ابتر شود

بهرِ شکرِ دوست هر موئے بدن دارم زباں　　گرچه بهرِ قتلِ من هر موئے او خنجر شود

چهرهٔ زیبائے خود را بنگر اندر آئینه　　وجه رازِ ہالئے ما تا بر تو روشن تر شود

در طریقِ عاشقی پائے مهندس راسخ است

یا رود سر در سرِ ایں کار یا ره سر شود

خصم سوخت چوں مست باده شود　　دلِ مردم ز دست داده شود

گر بسیرِ چمن سوار شدی　　در رکابِ تو گل پیاده شود

گر بزخمے دگر کنی مددے　　سینهٔ تنگِ ما کشاده شود

کعبه هر چند میرسد نزدیک　　شوقِ طوفِ حرم زیاده شود

کهنه شد آسماں مهندس خیز

تا بناهائے نو نهاده شود

دو یا قوتِ روان بخش تو آرامِ جهان باشد   دو ہاروتِ جهان سوز تو آشوبِ دوران باشد
رخت بر اوجِ زیباتے ملائک نیرِ تابان   قدت در باغِ رعنائی سہی سرو روان باشد
شہنشاہِ بلند اقبال دارا شاہِ دین پرور   الٰہی تا جہان باشد شہنشاہِ جہان باشد
مرا تا در بدن جانست و جان آمادۂ جوئے او   بود تا در تنِ من سر سرم بر آستان باشد
هندتس گر تو شہبازی برو بر دستِ شہ بنشیں
ترا در خار و خس تا کے چو مرغان آشیان باشد

عشقِ او حالِ ما تباه کند   زلفِ او روزِ ما سیاه کند
بر سرِ دیدۂ گدا جا ریست   امر و نہی کہ بادشاه کند
شاہِ من از گدا بترس کہ جیش   بکند آنچہ نیز آه کند
از زمین گرچہ آسمان دوراست   آه در لحظۂ آن را کند
منکہ مجنونِ لیلیٔ خویشم
کے هندتس بمن نگاه کند

گر بادشہ بلطف نظر بر گدا کند   بر بادشہ نظر بعنایت خدا کند
گر مے فروش حاجتِ ما را کند روا   پروردگار حاجتِ او را روا کند
باد شمال را نبود قدرِ نزدِ گل   شاید کہ عرض بلبلِ شیدا صبا کند
گر غنچہ بشنود سخنِ بلبلان چو گل   گل وار غنچہ پیرہنِ خود قبا کند
در حق من گمان خطا می بری خطا ست
ہرگز شنیدۂ کہ هندتس خطا کند

روئے تو رشکِ آفتاب بود		موئے تو ہمچو مشکِ ناب بود
گر ز روئے تو رشکِ خورشید است		پس چرا از تو در حجاب بود
روئے تو خوشتر از گلست و عرق		بر رخت خوشتر از گلاب بود
جگرِ خویش را بروں آریم		گر ترا خواہشِ کباب بود
از ہندسؔ مپرس نکتۂ عشق
کہ نہ ایں نکتہ در کتاب بود

اے دوست زبانِ تو زبانِ تو بود		خاموشئ تو مزید شانِ تو بود
راحت بہ طلب چوں دل کشائی خواہی		لب بستنِ تو نشاطِ جانِ تو بود
تیرِ تو بود سخن۔ کمانِ تو دہن		ایں تیرِ تو بہ کہ در کمانِ تو بود
گر دُر و گہر بود کلامِ تو خوشست		کایں دُر و گہر بہ بہر کانِ تو بود
مغرور بعلمِ خود ہندسؔ منشیں
کیں علم کہ خواندۂ گمانِ تو بود

ازاں بر زباں حرفِ غم می رود		کہ بر دل جفا و ستم مے رود
زبانِ دلم آنچہ تقدیر کرد		ہماں بر زبانِ قلم مے رود
باوجِ اجابت دعا مے رسد		کہ با نالۂ صبحدم مے رود
ز کف جام نگذاشت تا داشت جاں		ازاں بر زباں نامِ جم مے رود
ہندسؔ غنی شو بگنجِ ہنر
کہ از دست گنجِ درم مے رود

از بتاں جز ستم نمی آید — بوئے لطف و کرم نمی آید

بر دل و جانِ عاشقِ مسکیں — جز جفا و ستم نمی آید

دلِ من گرچہ دفترِ علم است — بر زباں حرفِ غم نمی آید

یارب آں شیخ را چہ پیش آمد — کہ بطوفِ حرم نمی آید

ہاں مہندس غمش مکن تحریر
کہ غمش در قلم نمی آید

کارم از یار بر نمی آید — از درم یار بر نمی آید

بر منِ خستہ دل نگاہ کنید — از حبیب ایں قدر نمی آید

از غمِ ہجر جاں بلب آمد — شبِ ہجراں بسر نمی آید

از نسیمِ سحر چہ سود مرا — کہ شبم را سحر نمی آید

گر رود از تنِ مہندس جاں
مہرش از دل بدر نے آید

یارِ من از سفر نے آید — ہمعنانِ ظفر نے آید

زیں طرف می رسد ہزار پیام — زاں طرف یک خبر نے آید

مردماں گرچہ صد فسوں خوانند — آں پری در نظر نے آید

صد نہالِ امید کاشتہ ام — یک نہالم بہ بر نے آید

صد دعا می کند مہندس ما
یک دعا کارگر نے آید

دردِ دلِ ما دوا ندارد　　بیماریٔ ما شفا ندارد
بر حالِ منِ غریقِ رحمت　　بیگانہ و آشنا ندارد
آں مہرِ سپہر خوب روئے　　یک ذرہ ہوائے ما ندارد
فریاد کہ بادشاہِ خوباں　　پروائے منِ گدا ندارد
ہرچند وفا کند مہندس
دلدار سرِ وفا ندارد

چوں حسنِ تو گل صفا ندارد　　چوں روئے تو مہ ضیا ندارد
در پیشِ تو آفتابِ انور　　جز مرتبۂ سہا ندارد
ہم چشمیٔ تست عزمِ نرگس　　ایں کور مگر حیا ندارد
در شہرِ تو اے نگارِ سرکش　　کس قاعدۂ وفا ندارد
در کوئے تو روز و شب مہندس
جز وصلِ تو مدعا ندارد

بلبل ز چمن خبر ندارد　　شاید بچمن گذر ندارد
افسوس کہ شاہِ ملکِ خوبی　　بر حالِ گدا نظر ندارد
جز زہر بکامِ ما ندیدی　　سوئے تو مگر شکر ندارد
فریاد کہ دلبرِ سکندر　　از دل شدگاں خبر ندارد
بے ہودہ منال اے مہندس
ز دل شدگاں خبر ندارد

دلِ ریشِ عاشق علاجے ندارد   ببوئے طبیب احتیاجے ندارد
تو شمعِ منیری و پروانہ دل   بہ از جان بیرون علاجے ندارد
گدا را مسلّم بود بادشاہی   چو حاجت بہ تختے و تاجے ندارد
ہماں بہ کہ ویراں شوی زانکہ سلطاں   ز اقطاعِ ویراں خراجے ندارد
بشہرے کہ دارد سکونت مہندس
متاعِ تنعّم رواجے ندارد

جاں بے جمالِ جاناں صبر و سکوں ندارد   صبرے کہ داشت ساقی جامِ کنوں ندارد
امروز چشمِ شوخش برما کشیدہ خنجر   زیباں چراست حالش گر مثلِ خون ندارد
نازاں کہ مہت قامت باللہ الف نباشد   حسنے کہ دارد اکنوں واللہ نون ندارد
ناز و کرشمہ باید تا دلبری کند کس   ورنہ کدام مہوش رو لالہ گوں ندارد
با آنکہ لافِ دانش میزد مہندس امّا
یک مو نداشت بر تن گو . . . ندارد

یک دل بدو کس نمی تواں داد   دل را بہوس نمی تواں داد
گر بانگِ جرس نمی رسد دل   بر بادِ جرس نمی تواں داد
در کوئے حبیب نیم شب جاں   از بیمِ عسس نمی تواں داد
اے شاہ ز بہر یک پیادہ   ہرگز دو فرس نمی تواں داد
دل را بدو کس مدہ مہندس
یک دل بدو کس نمی تواں داد

بکویش گذر کردن آسان نباشد　　بروئیش نظر کردن آسان نباشد
مرا تا بود یار در پیش دلبر　　ز کویش سفر کردن آسان نباشد
مرا تا بود عشق آں ماہ در دل　　غم از دل بدر کردن آسان نباشد
مرا تا بود مستی جامِ غفلت　　شبے را سحر کردن آسان نباشد
مہندس ز معنی چو آگہ نباشی
ز صورت گذر کردن آسان نباشد

چوں نوشتم بسوئے او کاغذ　　گشت خوشبو ز بوئے او کاغذ
گر بدستش نمی توانی داد　　پس بیفگن بکوئے او کاغذ
گردد از عکس روئے او رنگین　　گر کنی رو بروئے او کاغذ
گر بخواند نگارِ من گردد　　سیہ از عکس موئے او کاغذ
ہاں مہندس گذشت عمر دراز
کہ نیامد ز سوئے او کاغذ

اے شاہِ زمن بیا و بنگر　　دردِ دلِ من بیا و بنگر
از بوئے تو یاسمین خجل شد　　اے رشکِ سمن بیا و بنگر
حالِ گل و لالہ سرو و نرگس　　روزے بچمن بیا و بنگر
عہدِ منِ خستہ بر قرار است　　اے عہد شکن بیا و بنگر
شد تنگ دل از غمت مہندس
اے تنگ دہن بیا و بنگر

بلبل بچمن بیا و بنگر — حسنِ گلِ من بیا و بنگر
آبے کہ از و حیاتِ خضر است — در چاہِ ذقن بیا و بنگر
جورے کہ کند زمانہ بر من — اے شاہِ زمن بیا و بنگر
دُر ریزئیِ من چوں ابرِ نیساں — ہنگامِ سخن بیا و بنگر
در نبضِ مہندس اضطراب است
اے نادرِ فن بیا و بنگر

ہر چند کہ نامم را بپوشی بہتر — ہر چند کہ جامم را بنوشی بہتر
چوں سود و زیانِ خود ندانی بو حبیب — در سود و زیاں خود نکوشی بہتر
ہر چند کہ مے فروش بودن عیب است — در مشربِ یار خود فروشی بہتر
ہر چند سپہر را عناد است با تو — با مے تو اگر بہر جوشی بہتر
باآں کہ سخنوری مہندس لیکن
در محفلِ ما بود خموشی بہتر

جز جمالِ تو مرا نیست تماشائے دگر — جز وصالِ تو مرا نیست تمنائے دگر
من بہ یکجائے تو ہرگز نکنم تیزِ نگاہ — زانکہ ہر جائے تو بہتر بود از جائے دگر
من باین پا بتوانم کہ بکوئے تو رسم — مگر از آہن و فولاد بود پائے دگر
بارہا بوس و کنار از تو میسر شدہ بود — ایں زماں آمدہ ام بہرِ تقاضائے دگر
پاکباز است مہندس نظرِ بد نکند
در حقِ او نتواں بردگماں ہائے دگر

اے زجودِ تو کامرانیٔ دہر   از وجودِ تو پاسبانیٔ دہر
بخدائے خدایگانِ زماں   بتو زیبا خدایگانیٔ دہر
دہر را مدحِ تو وظیفہ بود   گوش کن بر وظیفہ خوانیٔ دہر
بتو زیباست خلعتِ شاہی   ز تو پیداست کامرانیٔ دہر
باشد از لطفِ تو ہندسؔ شاد
اے ز لطفِ تو شادمانیٔ دہر

سروِ من مست نو بہار ہنوز   پس بکن سیرِ لالہ زار ہنوز
سیرِ گلزار را غنیمت داں   کہ نہ رفتست نو بہار ہنوز
شد تنِ من غبارِ راہِ تو   در دلِ تو زمن غبار ہنوز
سالہا دل اسیر ماند و نیافت   بوئے آں زلفِ مشکبار ہنوز
دین و دل از کفِ ہندسؔ رفت
می کشد جورِ روزگار ہنوز

عمرِ عزیز بیہودہ شد صرف صد فسوس   حاصل نشد ز مدرسہ یک حرف صد فسوس
از دستِ ساقیانِ دل آشوب صد فغاں   بر حالِ تنگ بال تنک ظرف صد فسوس
موئے سفید۔ نامہ سیاہ۔ بد نما بود   ترکردہ لباسِ شبِ برف صد فسوس
بخل و طمع درونِ تو شد جمع زیں سبب   مال و زرے کہ بود۔ نشد صرف صد فسوس
اوراقِ شعرِ خویش ہندسؔ بآب دہ
بر نسخۂ توجدول شنگرف صد فسوس

گر دوست عنایت نکند پس چکند کس　　　از دوست شکایت نکند پس چکند کس

کس را نبود هیچ حمایت مگر از یار　　　گر یار حمایت نکند پس چکند کس

تنها که سماعش کنی از صحبت او بیت　　　راوی چو روایت نکند پس چکند کس

هر چند نهایت طلبی هست نهایت　　　گر رو به بدایت نکند پس چکند کس

لطفِ الله معمار و مهندس شد و استاد
گر کارِ درایت نکند پس چکند کس

آشفته کنِ دماغ ما باش　　　بر سنگ زنان ایاغ ما باش

با آنکه سراغ ما نیابی　　　هم در طلب سراغِ ما باش

هر چند که شمع بزم شاهی　　　یک شب به غلط چراغ ما باش

داغِ دلِ ما زکشت گاهی　　　مرهم نه روی داغِ ما باش

نظارهٔ لاله کن مهندس
امروز بیا بباغِ ما باش

موسمِ گل شد شراب تاک کش　　　هان مترس از محتسب بیباک کش

هیچ کس ز انجام کار آگه نشد　　　رو قلم بر دفترِ ادراک کش

ماه پیکر مهربانی می کند　　　آستین بر دیدهٔ نمناک کش

یا قدم در بزم میخواران منه　　　یا قلم بر صفحهٔ امساک کش

تا بکے شکلِ زمین خواهی کشید
رو مهندس صورتِ افلاک کش

شبے کآں مہ بود ما را در آغوش ‏ ‏ جفائے آسماں گردد فراموش
اگر نالم ز جورِ غمزۂ یار ‏ ‏ اشارت میکند ابرو کہ خاموش
شکایت دارم از زاہد کہ دارد ‏ ‏ صراحی در بغل سجادہ بر دوش
بیا با ما سوئے میخانہ زاہد ‏ ‏ شرابِ ناب نوش این زُہد مفروش

مہندس ہر چہ خواہی کن ولیکن
نصیحت ہائے واعظ را مکن گوش

اے کمان ابروانِ کافر کیش ‏ ‏ اینک این گوشۂ منِ درویش
خونِ من شیرِ مادر است ترا ‏ ‏ اے پسر این چہ مذہب است و چہ کیش
دل و دیں رفت و عقل و فکرِ کار ‏ ‏ بس ازیں تا چہ آیدم در پیش
من ز بیگانگان چرا نالم ‏ ‏ کہ خود آتش زدم بہ خرمنِ خویش

از مہندس کنید قطعِ نظر
اے نصیحت گرانِ خیر اندیش

از سرِ مہر و ز رہِ اخلاص ‏ ‏ بہوایت چو ذرہ ام رقاص
بندہ درگہت چہ زشت و چہ نیک ‏ ‏ عاشقِ طلعت چہ عام و چہ خاص
خواند الفِ قامتِ ترا کاتب ‏ ‏ گفت قوسِ ابروئے ترا وقاص
از خمِ زلفِ دل ندید نجات ‏ ‏ وز غمِ عشق جان نیافت خلاص

از مہندس مپرس نکتۂ عشق
مطلب از عوام سرِّ خواص

وصلِ تو ممکن نباشد گر بفرض — در دمی باشد میسّر طی ارض
نزدِ وسعت گاهِ دل باشد زمیں — کمتر از یک نقطہ با ایں طول و عرض
بوستاند مشک از زلفِ تو وام — نور گیرد ماہ از روئے تو قرض
صبحدم بادِ صبا در پیشِ گل — کرد حالِ بلبلِ سرگشتہ عرض
اے مہندسؔ باشد اندر کیشِ ما
بوسہ واجب دیدنِ دیدار فرض

بلبلم نغمہ گر زند بنشاط — مکند ہم زبانیش وطواط
مدہ آں جامِ خوشگوار کہ ہست — مایۂ عیش و آبروئے نشاط
شاہِ من شد پیادۂ فرزیں — بارہا دیدہ ام بروئے بساط
سرِ کاؤس و کے بود پنہاں — زیرِ بنیادِ ایں شکستہ رباط
ہاں مہندسؔ فلک بود شب و روز
در پے وصل و قطع چوں خیاط

در موسمِ بہار بود ترکِ مے غلط — مجنوں شوی و رہ نروی سوئے مے غلط
در صحبت و جوے درد بود یادِ عیش کذب — در گفت و گوئے فقر بود حرفِ کے غلط
[illegible] قصدِ دیر داشت رہ کعبہ کرد طے — تا از رہ غلط فتاد کہ کرد ہم سے مے غلط
قصد نشاط بے گل و ساقی و بے خرام — عزم سماع بے دف و قانون و نے غلط
بشگفت لالہ زار مہندسؔ شراب نوش
در موسمِ بہار بود ترکِ مے غلط

بے تو از سیرِ لالہ زار چہ حظ　　بے مے از فصلِ نو بہار چہ حظ
سرو من در کنار گر نبود　　از تماشائے جوئبار چہ حظ
گر نباشد نگارِ من ساقی　　از مئے نابِ خوشگوار چہ حظ
چوں مرا بوسے میرسد بمشام　　زاں حظ و زلفِ مشکبار چہ حظ
زد مہندس علم بر آر قرار
کہ دریں دارِ بے مدار چہ حظ

واعظا بہ منِ مست چہ گوئی سخن وعظ　　من بلبلِ عشقم نزدم در چمن وعظ
ہر چند کہ وعظ سخنِ وعظ لذیذ است　　کے گوش کند عاشق شیدا سخنِ وعظ
واعظ دلم از انجمنِ وعظ ملول است　　ہر چند کہ آراستۂ انجمنِ وعظ
زین آبِ کرم منع کند زاہدِ خود بیں　　من آبِ خودم خاک کنم در دہنِ وعظ
من بلبلِ عشقم نشوم شاد مہندس
آنجا کہ گلِ پند بود یاسمن وعظ

یاد ہر گاہ کہ مستانہ در آید بسماع　　عجبے نیست کہ کاشانہ در آید بسماع
گر بہ بت خانہ در آید مہِ من بہر طواف　　از نگاہش بت و بتخانہ در آید بسماع
در مقامے کہ شود شمعِ جمالت روشن　　دلِ عشاق چوں پروانہ در آید بسماع
موئے مشکینِ تو مشاطہ اگر شانہ زند　　از سرِ شوق بکف شانہ در آید بسماع
در سماع است مہندس ز شرابے کہ ازو
خم برقص آید و پیمانہ در آید بسماع

…ں مرا بلبل اجازت وا دمی آیم بباغ | چوں مرا ساقی اشارت کرد می گیرم ایاغ

…ی برم دست تهی در پیش ساقی بهر جام | گرچه پر دارم شرابِ ناب از دل تا دماغ

…زخم زلف تو جائے نیست عاشق را خلاص | وز غمِ عشقِ تو ممکن نیست شیدا را فراغ

…رنباشد دوست در محفل سفر ورزید شمع | ور نیاید یار در گلشن خزاں آید به باغ

اے مهندس چوں تو از سرِ فلک داری خبر
پس نیاری از من گمره چه می پرسی سراغ

…ں سکندر فر که دارد چهره چوں آئینه صاف | تا بکے آئین او یا رب بود بالا مصاف

…همی خواند برحمت ور همه راند بقهر | حکم حکم اوست از حکمش نونه ورزم انحراف

…ں سرو شمشاد بنده سرو آزاد مرا | ایں سخن از راستی باشد نه از لاف و گزاف

…ما آئینه دار خویش خواند هست فخر | مهر را بر شمع خود پروانه گوید نیست لاف

می کند نقص متاعِ جان مهندس را خجل
پیش جاناں گر برآرد جان بقصدِ اتحاف

…خلاں با دشمنان باشند چوں آئینه صاف | ابلهاں با دوستاں دارند بے جرمے مصاف

…اف تا قاف جهاں گشتم ندیدم روئے دوست | بعد ازیں توفیق اگر یابم زنم آں سوئے قاف

…ب بمسجد معتکف آں زاهدِ عالی مقام | نیست جائز عاشقاں را جز بکویت اعتکاف

…دم سرد رقیباں گر شوم تیره مزاج | گرچه باشد باطنم چوں ظاهرِ آئینه صاف

هم بلطف الله احمد کوس دانش میزدم
چوں شدم عاشق بجهلِ خویش کردم اعتراف

در جبینِ نست پیدا نورِ حق ہمچو نورِ مہر در جرمِ شفق
صد ورق دارد کتابِ عشقِ من خواندہ ام ہر صد ورق در یک سبق
در گلستانِ الٰہی دیدہ ام صد کتابِ معرفت در یک ورق
مہر را گہ اوج بخشد گہ حضیض ہست کارِ آسماں بہ یک نسق
ہاں مہندس زود کن فکرِ خلاص
زانکہ من در ششدرم زین نہ طبق

می رود شہسوارِ من بے باک سرِ عشاق بستہ بر فتراک
قاصر از درکِ ذات او دانش عاجز از فہمِ کنہِ او ادراک
گر بمن دوست مے کند نیکی از بدِ دشمناں ندارم باک
خندہ بر ماگدایان از چہ زنی اے لبت خشک و دامنت نمناک
از مہندس مجو شکایتِ دوست
گر دہد زہر ور دہد تریاک

روئے تو گل است و من چو بلبل آشفتہ و مبتلائے آں گل
جز بادِ صبا مگر کہ آرد بوئے خوش گل بسوئے بلبل
کو آں گلِ سرخ کز پئے او از خارِ جفا کنم تحمل
ہر چند کہ سنبل ست خوشبو بویش نرسد ببوئے کاکل
از حلقۂ زلف شد مہندس
ہم قائل دور و ہم تسلسل

بہ بیں در سینۂ افگارِ من گل — منہ برگوشۂ دستارِ من گل
دلِ من خار خارِ عشق او داشت — کنون بر دمید از ہر خارِ من گل
بیادِ آں گلِ خوش رنگ مانی — نویسد بر در و دیوارِ من گل
چوں آید آں بتِ گلچہرہ در دیر — دمید از رشتۂ زنارِ من گل
مہندس دوش میدیدم کہ در باغ
خجل گشت از رخِ دلدارِ من گل

صد چوں من گشتہ بر درِ تو قتیل — خونِ عشاق در رہِ تو سبیل
از نسیمِ عنایتِ تو شود — نارِ نمرود لالہ زارِ خلیل
زاں ز حسنت زمانہ یافت خجل — کہ ندارد زمانہ جز تو جمیل
تا نویسم ببوئے او نامہ — کاغذم باید از پرِ جبریل
جز مہندس کہ مے تواند بود
اگر از دورِ آسمان بخیل

اے ز روئے تو آفتاب خجل — وے ز موئے تو مشکِ ناب خجل
از جمالِ تو گل خجل گردد — در عرق مے شود گلاب خجل
پاک را در دمِ حساب چہ باک — وزد گردد دمِ حساب خجل
نظمِ من دید گشت دُر محجوب — نثرِ من خواند گشت آب خجل
چوں مہندس پیالہ شد مشغول
محتسب شد ز احتساب خجل،

دیدہ تا با تو آشنا کردم   گنجِ زر صرف توتیا کردم
بہرِ دیدن۔ بکوئے سرمہ فروش   دیدۂ خویش را گدا کردم
سوئے من یک نگاہ کردی و من   از برائے تو صد دعا کردم
کے بمنزل رسم کہ روئے طلب   در رہِ عشق بر خطا کردم
دوش عیب مرا مہندس گفت
من برد زیں سبب ثنا کردم

دل بعشق تو مبتلا کردیم   با دل خود بگو۔ چہا کردیم
وعدۂ خود وفا نکردی و ما   وعدۂ خویش را وفا کردیم
زاں طول است . . . .   بکف آوردہ و رہا کردیم
ریش ما خندہ بیشتر ند بر ما   تا دل ریش را دوا کردیم
اے مہندس ز بت پرستی ہا
نکند کافر آنچہ ما کردیم

تا شاہدِ وصال در آغوش کردہ ایم   افسانۂ فراق فراموش کردہ ایم
یک لحظہ بے صراحی و ساغر نبودہ ایم   آنگہ کہ قول پیر مغاں گوش کردہ ایم
با ما دراز میکند آتش زبانِ طعن   تا شعلہ ہائے عشق تو خس پوش کردہ ایم
ہرگز نرفت گرمیِ مے از دماغِ ما   زاں دم کہ جرعۂ زمیّت نوش کردہ ایم
از ما مکن حجاب مہندس شراب نوش
ما ہر چہ دیدہ ایم فراموش کردہ ایم

دیده ما امشب بیادِ دوست دریا می کنم
موج این دریائے پرخون را تماشا می کنم

شب بخواب آید مرا ماه و پری زانرو که من
وصل آں ماه و پری بنگر تمنا مے کنم

منکه چوں موسیٰ ندارم دستگاهِ خاصِ بحر
آشنائی با کشتی بان دریا مے کنم

واه که در حلِ معمائے محبت عاجزم
منکه در یک لحظه حلِ صد معما مے کنم

چوں مهندس دارم اندر سر هوائے سروری
منکه خود را همچو نقشِ پا تہِ پا مے کنم

جام وصل تو اگر نوش کنیم
دردِ هجر تو فراموش کنیم

هرگز از سر نرود گرمیٔ مے
گر ز مینائے تو مے نوش کنیم

نیست ممکن که به تدبیر خرد
آتشِ عشقِ تو خس پوش کنیم

گر شبے بخت مددگار شود
شاهد وصل در آغوش کنیم

ما نه آنیم مهندس که دگر
این فسوں هائے ترا گوش کنیم

گر شبے شاهد وصل تو در آغوش کنم
سالها قصهٔ هجر تو فراموش کنم

نرود لذتش از کام دل با صد شاد
شربت وصل تو یک لحظه اگر نوش کنم

آتشِ عشق تو زد شعله نگردد پنهاں
گر به تدبیر خرد بیهوده خس پوش کنم

سرِ ما درد نگیرد سحر از رنج خمار
شب اگر موعظت پیرِ مغاں گوش کنم

هاں مهندس کش این دردِ سر از عقل بیا
تا بیک جرعه ترا بے حس و بے هوش کنم

جز راہ وصال او نپوییم   جز وصفِ جمال او نگوییم
آوردۂ اوست عقل و دانش   پروردۂ اوست مو بمو ییم
صد بار نقاب او کشادم   یکبار نگشت رو بروییم
چوں یار نظر بحال من کرد   ہر چند کہ من بدم نکوییم
با آنکہ جفا کند مہندس
جز راہِ وفائے او نپوییم

جز وصف تو اے دلبر من ہیچ نمی دانم   جز مدح تو اے ہوش من ہیچ نمی خوانم
چوں فکر سر و سامان بتکدہ عشق آمد   نے طالب سر ہستم نے راغب سامانم
یکدل چہ بود صد دل خاکِ قدم دلبر   یکجاں چہ بود صد جان گردِ رہ جانانم
ناہید برقص آید گر بزم بیارآیم   سیمرغ بدام افتد گر دانہ بیفشانم
ہر گاہ مہندس را از اسرارِ تو پرسیدم
گفتا کہ دریں معنی من ہمچو تو حیرانم

بنشینم و روئے دوست بینم   چوں آئینہ رو برو نشینم
با آنکہ دہد ہزار اجازت   یک گل ز نہال او نچینم
خایف ز زمانہ در اماں است   زاں نیست اماں کہ من امینم
گر خون جگر و اشک من نیست   گلگوں ز چہ دوست آستینم
علمے کہ تو خواندۂ مہندس
نقشے ست نوشتہ بر نگینم

عاشقِ گوہرِ یکتائے تو ایم — بندۂ طلعتِ زیبائے تو ایم

صبح تا شام خیالِ تو بود — روز تا شب بہ تمنائے تو ایم

از جفاہائے رقیب است ملال — گرچہ خرم ز دلاسائے تو ایم

کامِ ما تلخ شد از زہرِ فراق — طالبِ لعلِ شکرخائے تو ایم

چوں مہندس ز سرِ عجز و نیاز
اے صنم خاکِ کفِ پائے تو ایم

نظارۂ بیان پری رو نکردہ ایم — دل را اسیرِ درخمِ گیسو نکردہ ایم

ما طائران گلشنِ قدسیم زین جہت — ہرگز بآب و دانۂ کس خو نکردہ ایم

زانہائے دہر غیر دو روئے ندیدہ ام — زاں روئے در محبت کس رو نکردہ ایم

چوں شرمِ چشمِ بلبلِ شیدا حجابِ ماست — گلہائے باغ را ز ادب بو نکردہ ایم

ما درسِ معرفت ز مہندس نخواندہ ایم
روئے نیاز جز سوئے زانو نکردہ ایم

طاعت ز روئے عجز سرِ مو نکردہ ایم — جز در رہِ گناہ تگاپو نکردہ ایم

با آنکہ آفتابِ منیر است رائے ما — خود را بذرہ سنگِ ترازو نکردہ ایم

در وصفِ زلف نامہ سیہ شد سحر دراز — با آنکہ وصفِ زلفِ تو یک مو نکردہ ایم

در ہر طرف کہ دلبرِ ما گشت جلوہ گر — از روئے صدق سجدہ جز آنسو نکردہ ایم

ہرچند بار نیست مہندس دراں حریم
ہرگز جدائی از سرِ آں کو نکردہ ایم

بر شمس و قمر نظر ندارم — وز کون و مکان خبر ندارم
پرواز کنم بر اوجِ گردون — هر چند که بال و پر ندارم
با آنکه ز دیده خون چکانم — سیمائے تو در نظر ندارم
هر چند هنر فزون غم افزون — صد شکر که یک هنر ندارم

از هندسه دم مزن مهندس
من طاقتِ دردِ سر ندارم

جز وصف تو بر زبان ندارم — جز مدح تو حرزِ جاں ندارم
از بهرِ تو دادہ دل و دیں — زین داد و ستد زیاں ندارم
زاهد سوئے کعبہ مغ سوئے دیر — من رغبت این و آں ندارم
دزدے نبرد بگنجِ من پے — زاں حاجت پاسباں ندارم

حرفے کہ شنیدم از مهندس
گر گوش کنی نهاں ندارم

فریاد کہ آرامِ دلِ زار ندارم — ز اسباب جهاں جز دلِ افگار ندارم
قانع شدم از سیرِ گلستاں بہ نسیمے — زیں باغ گلے بر سرِ دستار ندارم
در بزمِ تو هر گوشہ بساطے و نشاطے — من بر سرِ خود سایۂ دیوار ندارم
بے دیدۂ بیدار جمالت نتواں دید — افسوس کہ من دیدۂ بیدار ندارم

از جدول و پرکار گذشتہ چو مهندس
دل در گروِ جدول و پرکار ندارم

ہر چند کہ ما گرمیِ بازار نداریم — سر بر قدمِ پائے خریدار نداریم
باشد رگ ہر پے در تن رشتۂ زنار — اے برہمناں حاجتِ زنار نداریم
صد شکر کہ ما معتقدِ پیرِ مغانیم — انکار تو اے شیخ بجز انکار نداریم
تا چند نشینی و بما زہد فروشی — برخیز کہ ما زہدِ تو درکار نداریم

اسبابِ جہاں را نبود قدر بہ ہندس
سر نیز دریغ از قدمِ یار نداریم

عذاب زہد گذشت اکنون تبسم می‌توان کردم — براحوالے کہ من دارم ترحم می‌توان کردم
بصورت از گدایانِ خراباتی — بمعنی گرچہ بر شاہاں تقدم می‌توان کردم
لباس بادشاہی گر نباشد گو مباش اے دل — کہ در وضعِ فقیری ہم تنعم می‌توان کردم
میسر گر نشد طالع چراغ عقل بر کف نہ — نباشد آب اگر حاضر تیمم مے‌توان کردم

ہندس گر تبری از سخن چینیٔ نااہلان
بگفت و گوئے یونانی تکلم مے‌توان کردم

بموسمِ گل بادۂ گلرنگ می‌باید زدن — گر نباشد بادہ جامِ بنگ می‌باید زدن
گر بآغوش پری‌رویان ندارد دسترس — چوں منِ مسکیں بدامن چنگ می‌باید زدن
بر سرِ او سنگ باید زد بحکمِ پیرِ دیر — ہر کہ گوید جامِ مے بر سنگ می‌باید زدن
بر سرِ رحمت رسد گر یک اشارت زاں جناب — ہر قدم در رہ بصد فرسنگ می‌باید زدن

ہاں ہندس بگذر از عقل و خرد سنگِ جنوں
بر سر و بر سینۂ فرہنگ می‌باید زدن

بلبلِ زارِ تو ام اے گلِ خندانِ من — طلعتِ زیبائے تست شمعِ شبستانِ من
ہست دلِ زارِ من بلبلِ گلزارِ عشق — پیشِ بلا خارِ غم سنبل و ریحانِ من
گرچہ زبانم نکرد دردِ دلم آشکار — ناصیۂ من گواست بر غمِ پنہانِ من
تا نظرِ لطف کرد سوئے من آں شہریار — فرقِ رقیبست گوی در خمِ چوگانِ من
نوشِ لبِ لعلِ یار دردِ دلم را دواست
نزدِ مہندس مجو نسخۂ درمانِ من

من نہ آنم کہ بود مدحِ خسان پیشۂ من — نیست جز وصفِ بتان ہیچ در اندیشۂ من
شجرم را نبود نشو و نما ز آبِ طرب — پرورش ز آتشِ غم یافت رگ و ریشۂ من
تیشہ بر خود نہ چو فرہاد زنم آخر کار — کاو دل از سینۂ من آب خورد تیشۂ من
منم آں شیر کہ گر نعرہ زنم فیل دماں — ہمچو روباہ گریزاں رود از بیشۂ من
رو مہندس چو من از کون و مکاں مشتغلم
کے بود علم کم از مرتبۂ پیشۂ من

ساقیا برخیز و فکرِ جام کن — فکرِ ما افسردگانِ خام کن
وصل خواہی دین و دل بر دست نہ — عشق داری ترکِ نیک و نام کن
روئے او گوید صفا از روم جو — موئے او گوید گذر در شام کن
گر دلم تار است اے نورِ بصر — لحظۂ در چشمِ من آرام کن
ہست زاہد خاص و لطف اللہ عام
خاص را بگذار و فکرِ عام کن

جان نثار طلعت جانانہ کن　　خویش را بر شمع او پروانہ کن
کے بت تو با بت من ہمسر است　　برہمن ترک بت و بتخانہ کن
آشنائے گو نگیرد دوستِ تو　　خویش را زان آشنا بیگانہ کن
عہد و پیمان فلک باطل بود　　عہد و پیمان با مے و پیمانہ کن
ساقیا امشب بیک جامِ شراب
صد ہندسؔ را چو من دیوانہ کن

بادہ باندازۂ خود نوش کن　　بادۂ میخانہ فراموش کن
دل بہ کسے دہ کہ دل آرام تست　　پند من دلشدہ را گوش کن
سکۂ دولت چو بنامت زنند　　شاہد مقصود در آغوش کن
دشمن اگر جام مے آرد بریز　　دوست اگر زہر دہد نوش کن
باز ہندسؔ شدہ مغرور عقل
جام میش در دہ و بے ہوش کن

الٰہی خاطر ما شاد گرداں　　دل ویرانِ ما آباد گرداں
بعالم ہر کجا یار یست شیریں　　مرا بر حسن او فرہاد گرداں
ز تاب آتشِ عشق بتِ چیں　　دلم را کورۂ حداد گرداں
گلوئے عاشق جانباز راند　　ز آب دشنۂ فولاد گرداں
بسعیٔ بازوئے عشق خرد سوز
ہندسؔ را ز عقل آزاد گرداں

در دل اے صنم بیا و بہ بیں   حال شیخ و حرم بیا و بہ بیں
نالۂ نیم شب نمی شنوی   گریۂ صبحدم بیا و بہ بیں
گر تو بر خستگان نظر داری   حال این خستہ ہم بیا و بہ بیں
ہر کہ آئینۂ سکندر داشت   ہمہ در جام جم بیا و بہ بیں

ماہ من بر مہندس از گردون
این جفا و ستم بیا و بہ بیں

لحظۂ در چمن بیا و بہ بیں   رنگ سرو سمن بیا و بہ بیں
بے جمال تو جامہ دارد چاک   حال گل در چمن بیا و بہ بیں
گر تو آب حیات مے خواہی   آب چاہ ذقن بیا و بہ بیں
دلم از زلف تو شکستہ تر است   اے بت دلشکن بیا و بہ بیں

ہاں مہندس گہر فشانیٔ من
در مقام سخن بیا و بہ بیں

برش در طراوت بہ از یاسمیں   لبش در حلاوت بہ از انگبیں
شب از پرتو روے او نور یاب   در از خرمن حسن او خوشہ چیں
جمال ترا رشک ماہ آفرید   ہزار آفریں بر جہاں آفریں
مشو شاد و غمگیں ز اوج و حضیض   کہ گاہے چناں ہست و گاہے چنیں

مہندس فرامش کنی ہندسہ
بما لحظہ گر تو شوی ہم نشیں.

باشند بهر نام و نشاں گمرہان رہین   یکدم برون ز عالم نام و نشاں نشین
من را صنم ببیں کہ شود جانِ من نثار   رحمی نمی شود دل سیمین بر آن بریں
بود آسمان شریف ترا با ذاتِ تو   از آسمان شریف تر است این زمان زمیں
خاہی دریں زمانہ بمقصود دل رسد   از فتنۂ زمانہ بیا بدامان امیں

بلبل بروئے گل خوش و قمری بقد سرو
زیں بوستاں نصیب ہندتس نہ آن نہ این

دارا شکوہ شاہ جہان - بانیِ جہان   بر وے مبارک ست سلیمانیِ جہاں
پروردگار باد نگہبان دولتت   زانرو کہ کارِ تست نگہبانیِ جہاں
تا زآب و آتش است نشاں در زمانہ باد   روشن ز خاک پائے تو پیشانیِ جہاں
اے بانیِ جہاں کہ جہاں در ثنائے تست   یک لحظہ گوش دار ثنا خوانیِ جہاں

تا کے ہندتس است پریشاں چو زلفِ یار
اے از تو دور گشتہ پریشانیِ جہان

چشمِ من روشن از جمال بتاں   طبعِ من گلشن از خیالِ بتاں
در دلِ زارِ عاشقاں شبِ ہجر   ہست سودائے خط و خالِ بتاں
تا تو از جان و دل نشوی دوست   دست کے میدہد وصالِ بتاں
لات و عزیٰ نہ صرف لب بستند   تا شنیدند قیل و قالِ بتاں

گرچہ بودم ہندتس و دانا
شدم آشفتۂ جمالِ بتاں

باشد از درد فرقت یاراں — چشم من ابر اشک من باراں
می نویسد خطوط بر لب لعل — نسخہ ہائے علاج بیماراں
بجنون و فنا نہ ممکن نیست — فکر آزادی گرفتاراں
قصہ ہائے شب دراز فراق — گوش کن از زبان بیداراں

تا مہندس بنائے قصر سخن
می کند شہ رئیس معماراں

چو سرو من بباغ آمد خراماں — کند فرمان بری گل چوں غلاماں
مرا تا با بتاں باشد سرو کار — تنم را سربسر رانیست ساماں
نہ بیند بر من آلودہ دامن — بچشم لطف شیخ پاک داماں
چوں نام من بہ بدنامی بر آمد — دوائے من کنید اے نیک ناماں

مہندس را بپرس اسرار عشاق
نباید سِر خاصاں فہم عاماں

در آغوش تو باشد جان جاناں — ازاں بہتر کہ باشد خانخاناں
ترا از خانخانانی چہ حاصل — در آغوش ار نباشد جانجاناں
نیاید دل بدست من کنوں رفت — دل از دستم بدست دل ستاناں
اگر ما نا توانیم او توانا ست — نوا می دہ تو با نا توا ناں

مہندس پیر شد خلوت نشین گشت
مبارک سیر گلشن بر جواناں

ہادیِ ما مردمِ آوارہ کو چارۂ ما مردمِ بیچارہ کو
راحتِ جانِ منِ مسکیں کجاست مرہمِ درد و دلِ صد پارہ کو
آں طرف ہر دم خطاب آمد ولے مردماں را طاقتِ نظارہ کو
مردماں ہر گاہ می بینند گل چشم می گوید کہ از رخسارہ کو
چوں مہندس با محیط است آشنا
انتہایش بر منِ بیچارہ کو

اے خدائے من و خدائے ہمہ تو اجابت کنی دعائے ہمہ
کبریائے تو دارد استغنا از ثنائے من و ثنائے ہمہ
خوانِ الوانِ نعمتِ تو مدام باشد آمادہ از برائے ہمہ
ریزہ چینانِ خوانِ احسانت گشتہ مستغنی از عطائے ہمہ
تا مہندس بنورِ تست منیر
دیدہ بر دوخت از ضیائے ہمہ

قدرِ مویش ہمچو قدرِ لیلۃ القدر آمدہ رُوے داں مہ ہمچو بدرِ لیلۃ القدر آمدہ
دور ماند از شستِ ہدفِ مقصود تا شامِ ابد ہر کہ کارش از دمِ صبحِ ازل غدر آمدہ
عزتِ مجنوں بود در دیدۂ لیلےٰ اگر گرچہ در چشمِ رقیباں خوار و بے قدر آمدہ
گر بمردم چشم زخمے در اُحد آمد چہ باک کز اُحد چندیں ظفر چوں خیبر و بدر آمدہ
دوست در بزمِ مہندس مسند آرائی مجو
زانکہ بزمش ہر طرف چوں دائرہ صدر آمدہ

شاہِ من نام را بپوشی بہ ماہ من جام را بنوشی بہ
چو بکوشش نمیدہد رزّاق انپئے رزق اگر نکوشی بہ
کس خریدار خود فروشی نیست مے فروشی ز خود فروشی بہ
دشمنت گرچہ میزندم سرِ تو بگرمی چوں دوست جوشی بہ
گر ترا عزمِ حکمت آموزست
از مہندسؔ سخن نیوشی بہ

توبہ در نوبہار یعنے چہ نرگسے در خمار یعنے چہ
من چوں آئینہ صاف دل شدہ ام در دلِ من غبار یعنے چہ
بلبلے را کہ گل در آغوش است نالۂ زار زار یعنے چہ
بوثاقِ من آید او جاناں نکنم جان نثار یعنے چہ
فرض کردم مہندسے وحکیم
ایں ہمہ افتخار یعنے چہ

ز شنبہ می پزم سودائے جمعہ سر شنبہ فدائے پائے جمعہ
نہ بینم چہرہ یک شنبہ دو شنبہ بہ بوسم لعل شکر خائے جمعہ
سہ شنبہ چہار شنبہ پنجشنبہ فدائے طلعتِ زیبائے جمعہ
ازاں در جمعہ خاطر می نشود جمع کہ جمعیت بود معنائے جمعہ
مہندسؔ تا بود در تن دل و جان
بجاں باشد دلم جویائے جمعہ

تا در بدن روانست خواہم بقائے جمعہ ‌ ‌ ‌ ‌ تا در دہن زبان ست گویم ثنائے جمعہ
یکشنبہ و دوشنبہ زاں پس بود سہ شنبہ ‌ ‌ ‌ ‌ بعد از دو روز دیگر بینی لقائے جمعہ
یارب چہ روز میمون در قصر آفرینش ‌ ‌ ‌ ‌ بر ساحت زمانہ کردی بنائے جمعہ
گر ہجو می نویسی بنویس ہجو شنبہ ‌ ‌ ‌ ‌ خواہی ثنا بگوئی بر گو ثنائے جمعہ
چوں مدح را نیامد کس در زمانہ قابل
زاں زو درستم مہندس مدح از برائے جمعہ

بیا ساقی زمے پر کن ایاغے ‌ ‌ ‌ ‌ بجام بادہ رنگین کن دماغے
بنور برق کے محتاج باشم ‌ ‌ ‌ ‌ بدستم گر بود روشن چراغے
ز دست آتش عشق تو ہر دم ‌ ‌ ‌ ‌ مرا بر سینہ باشد تازہ داغے
دراں گلشن کہ بلبل نغمہ می زد ‌ ‌ ‌ ‌ نمی آید کنوں آواز زاغے
مہندس تا گل روئے بتاں دید
نمی خواہد دلش گلگشت باغے

پس از عمرے میسر شد فراغے ‌ ‌ ‌ ‌ بکن با ما دمے گلگشت باغے
نخواہد کم شد اے ساقی ز صد خم ‌ ‌ ‌ ‌ بیک جام ار کنی رنگیں دماغے
دل فرہاد را رنگیں نباشد ‌ ‌ ‌ ‌ کہ باشد از غم شیریں فراغے
اگر پروانہ را باشد ملالت ‌ ‌ ‌ ‌ نیفروزیم در محفل چراغے
ز مرکز روئے من در شش جہت گرد
مہندس را چو پرسیدم سراغے

در کنارم نگار بایستی — در کفم زلف یار بایستی
درچنین دشت و درچنین صحرا — بادۂ خوشگوار بایستی
تا کند نقد او خریداری — جنسِ کامل عیار بایستی
تا زنم دستِ خود بدامنِ دوست — قالبِ من غبار بایستی
بمہندس شراب دہ کہ مرا
دشنۂ آبدار بایستی

راستی آنکہ دارد اُستادی — نرود در راہ و رسم آزادی
نبود در دولت محبتِ گنج — تا دلت می کشد بآبادی
نشوی عزہ ایں عروسِ جہاں — گر قبولت کنی بدامادی
زخمِ دلدار بہتر از مرہم — بود آنرا کہ غم بود شادی
رو مہندس بما مکن دعوےٰ
گرچہ درفنِ خویش استادی

جز مدحِ تو نیست گفت وگوئے — جز سوئے تو نیست جستجوئے
باللہ کہ کافرم نہ مومن — گر ہیچو تو دیدہ ام نکوئے
پیراہنِ خود چو گل کند چاک — از باغِ تو ہرکہ یافت بوئے
گر عکسِ جمالِ تو نباشد — ہرگز نکنم نظر بروئے
با بحر شدآشنا محال است
سرے . . . .

اے خوش آں چشم کہ بر روئے تو دارد نظرے — وے خوش آں پائے کہ در کوئے تو دارد گذرے

کے بود آمدنِ قاصدِ فرخندہ پیام — مدتے شد کہ ز لاہور نیامد خبرے

تلخیٔ کامِ دلِ خویش چو گفتم بطبیب — گفت باید ز لبِ لعلِ بتاں گلشکرے

دوست در نامِ نکو کوش کہ در دارِ فنا — بہتر از نامِ نکو ہیچ نماند اثرے

می شنیدم کہ سراپائے مہندس ہنر است
چوں بدیدم ہمہ عیب است ندارد ہنرے

باید کہ تو بے ریا نشینی — چوں آئینہ با صفا نشینی

خاکِ درِ فقر باش ہرچند — بر ذرۂ کبریا نشینی

شاید کہ بمدّعا بری پے — گر طالبِ مدّعا نشینی

دانی کہ چہ میکشد دلِ زار — روزے کہ بحالِ ما نشینی

در کوئے نگارِ خود مہندس
باید کہ چو نقشِ پا نشینی

ناصحا گر تو شبے طلعتِ آں مہ بینی — ما بروئے کہ نشستیم تو ہم بنشینی

گر تو خواہی کہ شوی عارف و حق بیں باشی — ہر چہ خواہی بکن امّا نہ کنی خودبینی

ہاں مکن عُجب و تکبر کہ خداوندِ کریم — نخرد ہیچ مگر عاجزی و مسکینی

ساقیا دہ مے رنگین پئے رنگینیِ بزم — بزم را بے مے رنگین نبود رنگینی

اے برادر نبری راہ ز مرکز بکنار
تا تو در دائرۂ خود را چو مہندس بینی

اے عمرِ رواں چو آب رفتی — دیر آمدی و بشتاب رفتی
در دیدهٔ من جہان بود تار — زاں دم کہ چو آفتاب رفتی
صد شکر کہ در دمِ گذشتن — بیدار تر از حباب رفتی
اندیشهٔ زاہدی خطا بود — اکنوں بره صواب رفتی
با آنکہ مہندسے ندانم
کز بہر چہ بر سراب رفتی

ندہی جامِ بادہ معذوری — نیاگه ز رنجِ مخموری
من ملولم تو زاہدا مسرور — چہ گماں بردهٔ کہ مغفوری
گوشہ گیرد ز حلقهٔ مستان — ہر کرا ہست میلِ مستوری
نکنم از تو جز تو ہیچ طمع — بندگی مے کنم نہ مزدوری
بر خط و خالِ تو مہندسِ ما
زاں نظر می کند کہ منظوری

زلفِ دل مے برد بطرّاری — غمزه خوں مے کند بعیاری
کس چو معشوقِ من نمی داند — شیوهٔ دلبری و دلداری
سینهٔ تنگِ ما کشاده بود — گر بزخمے کند مددگاری
از محقق چرا شود صادر — گلهٔ آسمانِ زنگاری
جز مہندس کہ مے تواند بود
آگه از دورِ چرخِ پرگاری

منال از ستمِ آسمانِ زنگاری
که آسماں چو تو باشد مسخّر باری
بفرِّ دولتِ دنبالۂ دوں ہشو مغرور
که از فریبِ عجوزِ جہاں خبر داری
کسے بگو ہر یکے دانہ آشنا گردد
چو صبح و شام کند چشمِ او گہر باری
چرا ز شہر بسیرِ چمن بروں آئی
کنونکہ گل شده از شاہدانِ بازاری

ہندس از تو چو مرکزِ ثبات مے جوئی
مگر دگر دِ جہاں چوں سپہر پرکاری

داے زپئے شکار داری | زلفے که برآں عذار داری
مردم ہمہ سرخوش و سرمست | زیں چشم که پرخمار داری
پیوسته کشی کمان ابرو | شاید ہوس شکار داری
بنما رُخِ خویش مردماں را | تا چند در انتظار داری

احسنت ہندس از پے شاه
نظمِ دُرِ شاہوار داری

بلبل دل و جان فگارداری　　زاں نالۂ زار زار داری
بر صفحۂ دہر باید امروز　　حرفے دو سہ یادگار داری
ہر حرفِ بلند بعد مردن　　شمع ست کہ بر مزار داری
اے شام و سحر بعیش مشغول　　باغمزدگان چہ کار داری
بگذر چو مہندس از دل و جاں
گر ذوقِ وصالِ یار داری

زاہد تو ز بادہ عار داری　　بے بادہ کشاں چہ کار داری
از دست مدار جام و بادہ　　در دست گر اختیار داری
من ہیچو تو دیگرے ندارم　　اے آنکہ چو من ہزار داری
من ہیچو غبار خیزم از جائے　　در دل ز من از غبار داری
با کام مہندس آشنا کن
گر دشنۂ آبدار داری

شہا گوش بر دادخواہے نداری　　بحالِ گدایان نگاہے نداری
رقیباں بقتلم نوشتند فتوےٰ　　وگر نہ تو ہرگز گناہے نداری
جہاں سر بسر خیرخواہ تو باشد　　ولے ہیچو من خیرخواہے نداری
بیاری صبا سوئے بلبل پیامے　　مگر سوئے گلزار راہے نداری
مہندس ازاں رو نداری وقارے
کہ چوں زاہداں خانقاہے نداری

یوسف خبر از پدر نداری — از دیو و پری خبر نداری
شاہا ز غرورِ حسن ہرگز — بر حال گدا نظر نداری
ہرچند کہ زر فزون غم افزون — مفلس تو خوشی کہ زر نداری
آنہم اثرے نداشت اکنون — اے نالہ تو ہم اثر نداری

خاکِ درِ دوست شو مهندس
زاں رو کہ درے دگر نداری

تمت تمام شد تا تحریر
۷ ای اے ٦ ذی الحجہ سنہ ۹
بوقت شب تحریر یافت

سنہ ۴ جلوس عالمگیری

قصاید و قطعات تاریخی

شاهِ جہان داورِ گیتی ستاں   روشنیٔ دودۂ صاحب قران
عرشِ بریں قبۂ درگاهِ اوست   رشکِ فلک سدۂ درگاهِ اوست
احمدِ معمار که در فنِ خویش   صد قدم از اہلِ ہنر بود بیش
واقفِ تحریر و مقالاتِ آں   آگہِ احوال و حوالاتِ آں
حالِ کواکب شده معلومِ او   سرِ مجسطی شده مفهومِ او
از طرفِ داورِ گردوں جناب   نادرِ عصر آمده اورا خطاب
بود عمارت گرِ آں بادشاه   داشت دراں حضرتِ فرخنده را
آگره چوں شد مضربِ رایاتِ شاه   بس که بر و بود عنایاتِ شاه
کرد بحکمِ شہِ کشور کشا   روضۂ ممتاز محل را بنا
باز بحکمِ شہِ انجم سپاه   شاهِ جہان داورِ گیتی پناه

قلعۂ دہلی کہ ندارد نظیر　　کرد بنا احمدِ روشن ضمیر

این دو عمارت کہ بیاں کردہ ام　　در صفتش خامہ رواں کردہ ام

یک ہنر از گنجِ ہنرہائے اوست　　یک گہر از کانِ گہرہائے اوست

چوں نبود عالمِ فانی مقر　　کرد سوئے عالمِ باقی سفر

پس سہ پسر ماند ز مردِ سترگ　　زاں سہ عطاء اللہ رشید بزرگ

نادرِ عصرِ خود و مشہورِ شہر　　عالم و علامہ و دانائے دہر

مردِ ہنر پرور و استادِ فن　　فاضلِ دانشور و حبرِ زمن

مخزنِ علم آمدہ تالیفِ او　　گنجِ ہنرہاست تصانیفِ او

نثرِ وے از آبِ رواں پاک تر　　نظمِ خوشش غیرتِ سلکِ گہر

منکہ سخن پرور و دانشورم　　بندۂ آں حبرِ سخن پرورم

منکہ ربودم ز جہاں گوئے علم　　از مددش یافتہ ام بوئے علم

منکہ شدم آگہ سرِّ نہاں　　از دمِ او یافتہ ام قوتِ جاں

ثانیِ آں ہر سہ برادر منم　　ہندسہ یک فن بود از صد فنم

گرچہ مہندس لقبم از شہ است　　نامِ من دل شدہ لطف اللہ است

ثالثِ آں ہر سہ برادر بسال　　آمدہ نور اللہ صاحب کمال

ما ہمہ معمار و عمارت گریم　　ما ہمہ استاد و سخن پروریم

لیک بود قصرِ کلامش عجب　　زاں شدہ معمار مراد از لقب

گرچہ کمست سالِ وے از سالِ من　　بیش بود از حالِ او از حالِ من

نثرے از نظم گہربار تر
نظم ز نثر آمده هموار تر

دیده از نورِ سخنش پُرضیا
طبع ز لطفِ سخنش پُرصفا

گنجِ هنر آمده در مشتِ او
هفت قلم رانده سرِ انگشتِ او

گرچه منم بے سخن استادِ فن
آں یکے ایں یک بود استادِ فن

گرچه مرا هست مهندس لقب
هندسه زاں هر سه برادر طلب!

لطفِ شه مے کند مددگاری
ورنه آگه نیم ز معماری

خوانده ام یک دو نسخه از هر باب
هیئت و هندسه و نجوم و حساب

نه نویسم ز بیم بے ادبی
هرچه خوانده ام من از عربی

لیکن اکنوں چه جائے ...
فکرِ ایوان و خانه ... است

لطفِ شهزادهٔ بلند اقبال
گر شود بنده را معاونِ حال

خدمتے بنده را بفرمائید
که از و علمِ رفته باز آید

گر یکے از مقربانِ بساط
در دمِ عیش و در زمانِ نشاط

ایں سخن از مقیمِ ایں درگاه
برساند بسمعِ حضرتِ شاه

اجر باید ز کردگارِ کریم
نه که اجرِ قلیل اجرِ عظیم

اخترِ برجِ حشمت و اجلال
گوهرِ درجِ دولت و اقبال

نیرِ آسمانِ بینائی
آفتابِ سپهرِ مینائی

منبعِ جود و مخزنِ احسان — مظهرِ فیض و معدنِ اتقان
زبدهٔ دودمانِ مصطفوی — نخبهٔ خاندانِ مرتضوی
امرا را شرفِ امارتِ او — وزرا را شرفِ وزارتِ او
امرا از امارتش منصور — وزرا از وزارتش دستور
آبِ شرع است سیفِ مسلولش — دستِ عدل است رمحِ مصقولش
از ازل سربلندِ کونین است — تا ابد ارجمندِ دارین است
با هنر جفت و در هنر طاق است — شعرِ او منتشر در آفاق است
عنصری بندهٔ کمینهٔ او — عسجدی عاشقِ سفینهٔ او
بوالفرج عندلیبِ گلشنِ او — انوری خوشه‌چینِ خرمنِ او
فرخی از صحیفه‌اش ورقی — آصفی از کتابِ او سبقی
نظمِ او پائے تا بہ سر همه دُر — نثرِ او گشته از لآلی پُر
شعرِ او دیده را ضیا بخشد — خاطرِ تیره را صفا بخشد
نظمِ او همچو نثر هموار است — نثرِ او همچو نظم دُربار است
راحتِ جان دهد ترانهٔ او — غفلتِ دل برد فسانهٔ او
خامهٔ او چو ابرِ نیسان است — نامهٔ او چو بحرِ عمّان است
ابرِ نیسان گدائے خامهٔ او — بحرِ عمّان فدائے نامهٔ او

مجلس از دلبرانِ سیمین تن — گشته غبطِ بهار و رشکِ چمن
خوبیِ چهرهٔ بتانِ چگل — برده از زاهدانِ عابد دل

بادهٔ سرخ رنگ در مینا / می برد هوش بوعلی سینا
همه اسبابِ عیش تیار است / شاهِ من مقدمِ تو در کار است
باید از مقدمِ مبارکِ خویش / منزلِ قدرِ بنده سازی بیش

دولتِ جاویدِ بختِ سرمد و ملکِ مدام / همعنان و همدمِ شاهِ بلند اقبال باد
از کفِ دستش دُر و گوهر برد دریا و کان / تا ابد دریا و کان زین فیض مالامال باد
می کند احسانِ او درماندگان را یاوری / یاورِ او ایزدِ ذوالمجد ذوالافضال باد

ثناخوانِ ترا شاها چه حاجت مدحِ جم گفتن / بجامِ باده حاجت نیست مستِ جامِ حیدر را
چه می خواهد کجا باشد بانیِ قصرِ ثنائے تو / بکارِ خشت و گل مگذار لطفِ الله احمد را

که خدا گشت با قبالِ بلند / پورِ دارائے زمان شاهِ زمین
در زمانے که مراداتِ جهان / بود در دستش چو در دست نگین
گفت جبریلِ امین تاریخش / بسلیمان شده بلقیس قرین

چون بنا کرده قصرِ جاه و جلال / ظلِ حق بادشاهِ عالی ملک
شبتهٔ این عمارتِ والا / یافت چون بر حوالی ملک
گفت معمار سالِ تاریخش / قصرِ دارا شکوه والی ملک

چون تیار شد این کلیدِ ظفر | بفرمانِ دین پرور و حق پژوه
پئے سال تاریخِ انجامِ وے | خرد گفت مفتاحِ دارا شکوه

در زمانِ سعید شاه جهان | شاه عالم پناه جم مقدار
نادر العصر رفت و گفت خرد | شد بفردوس احمدِ معمار

آن نادرِ عصر زبدهٔ دهر | چون رفت بسوئے ملکِ سرمد
تاریخ وفاتِ او خرد گفت | محمود العاقبت شد احمد

می تواند بود طوطی همدمِ مارِ سفید | می تواند رفت ماهی همرهِ مارِ سیاه
می تواند بود آهو همزبانِ شیرِ شرخ | می تواند کرد یوسف خواب خوش در قعرِ چاه
وز هندس آن می آید که یکدم یک نفس | با منافق همزبانیها کند در طیِ راه

یک لحظه دلم طاعتِ معبود نکرد | معبودِ حقیقی آنچه فرمود نکرد
فریاد که آنچه کرد مقصود نبود | افسوس که آنچه بود مقصود نکرد

تمت تمام شد

بتاریخ بیستم رمضان المبارک سنه ۱۱۵۷ دیوان هندس
خرید شد بسرکار نواب ابراهیم خان بهادر
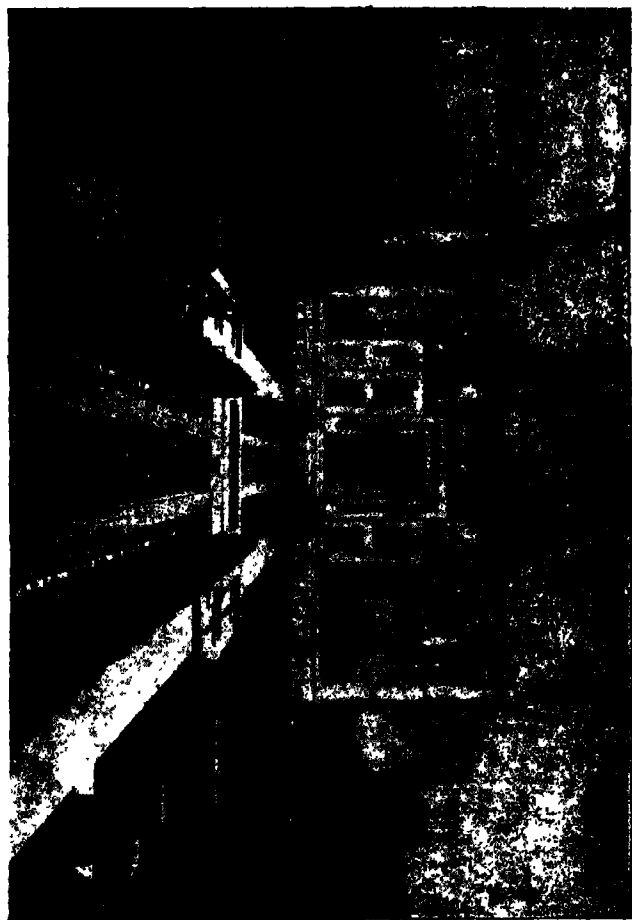
سیرِ تاج

(از حضرت سیماب اکبرآبادی)

آگرہ فورٹ سٹیشن سے وکٹوریہ پارک طے کرتے ہوئے آگرہ کے مشرقی کنارہ اور دریائے جمن کے جنوبی ساحل پر جب ہم پہونچتے ہیں تو ہمیں "تاج محل" کی تاریخی عظیم المنزلت عمارت نظر آتی ہے۔ سب سے پہلے ہمیں ایک سو فیٹ کا مرتفع صدر دروازہ ملتا ہے جس کے سامنے ایک وسیع چبوترہ ۱۱۲½ فیٹ عریض اور ۸۶¼ فیٹ طویل ہے صدر دروازہ کی پیشانی اور اطراف میں سورہ "والفجر" جلی قلم سے کندہ ہے۔ سنگِ مرمر پر سنگ موسیٰ کی پچیکاری سے عبارت لکھی گئی ہے۔ اس میں سب سے بڑا کمال تحریر یہ ہے کہ ہر حرف جتنا بڑا نیچے سے نظر آتا ہے۔ اتنا ہی بڑا اسی فیٹ کی بلندی پر بھی نظر آتا ہے۔ حروف کی یہ تقسیم کمال کتابت کو کس قدر پر صنعت بنا دیتی ہے۔ دروازہ میں ہشت دہاتی بڑے بڑے کواڑ لگے ہوئے ہیں جن پر پیتل کی کیلیں جڑی ہوئی ہیں صدر دروازہ کا حصہ مثمن ہے جس کا قطر ۴۱½ فیٹ ہے۔ اوپر چڑھنے کے لئے چار

زینے ہیں۔ چھت کی اندرونی سطح سُرخ ہے جس پر سفید چونے سے جالدار اور پیچدار
کام بنا ہوا ہے۔ اس کام کو اصطلاح تعمیر میں "غالب" کہتے ہیں۔

چھت کی تین منزلیں ہیں۔ تیسری منزل پر آٹھ آٹھ در کے چار برج ہیں۔ جن پر
سنگ مرمر کے خوش نما گنبد اور پیتل کے کلس چڑھے ہوئے ہیں۔ چھت کے درمیانی حصہ میں
سولہ پہل کا ایک مرتفع چبوترہ بنا ہوا ہے چھت کے دونوں طرف شمالی و جنوبی دیواروں میں
دو دو گلدستے سنگ سرخ کے بنے ہوئے ہیں اور گیارہ گیارہ برجیاں گلدستوں کے
درمیان میں ہیں۔ ان برجیوں پر بھی کلس چڑھے ہوئے ہیں۔ صدر دروازہ کے دائیں
بازو پر سورۃ "والضحیٰ" پیشانی پر سورۃ "انشراح" اور بائیں بازو پر سورۃ "والتین" لکھی
ہوئی ہے۔ آخر میں "تمت بعونہ تعالیٰ ۱۰۵۷ھ" لکھا ہوا ہے۔

فصیل تاج میں

اب ہم فصیل کے اندر ہیں۔ صدر دروازہ سے ملحق دونوں سمتوں
میں غرباً اور شرقاً ۲۹ - ۲۹ در کے دالان اور دالان بنے
ہوئے ہیں۔ فصیل کے دونوں کونوں پر سہ منزلے برج ہیں۔ سامنے دیکھئے تو وہی
نورانی مقبرہ فردوس نظر ہے جس میں صاحب قران شاہ جہان علیہ الرحمۃ اور ملکہ ممتاز محل
ارجمند بانو بیگم آسودۂ خواب ہیں۔

تسنیم و سلسبیل

صدر دروازہ سے نکلتے ہی نگاہ کے سامنے سرو صنوبر
اور مختلف قسم کے شاداب درختوں سے لہلہاتی ہوئی
ایک جنت تسنیم نظر آتی ہے اور دو نہریں (۱۶½ فیٹ چوڑی) براہ راست مقبرہ
تک سلسبیل اور تسنیم کی متصورہ اور متخیلہ تصویر دل کو متشکل کرتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ صدر
دروازہ کے سامنے والے چبوترہ سے حوض تک ۴۱۲½ فیٹ کا فاصلہ ہے۔ نہریں

تاج محل
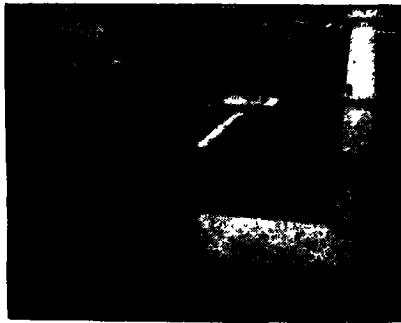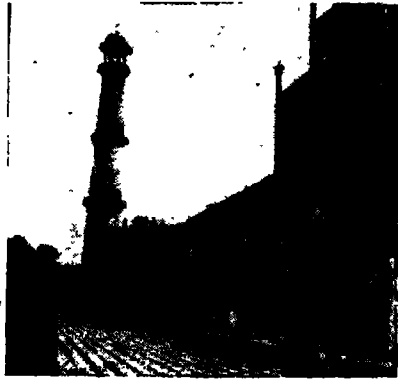
میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر فوارے نصب ہیں اور صاف و شفاف پانی بھرا رہتا ہے

کوثر مرمریں

اس ارضی جنت کو جنت موعود کا نقش مصور بنانے کے لئے وہ تمام خصوصیات جمع کر دی گئی ہیں جن کا جنت میں ہونا یقین کیا جاتا ہے۔ دو نہریں تسنیم و سلسبیل کا جواب ہو گئیں۔ اب وسط باغ میں اس مرمریں حوض کو دیکھئے جس میں نہایت صاف پانی بھرا رہتا ہے۔ رنگا رنگ مچھلیاں سطح آب پر محو رقص ہیں۔ کناروں پر کنول کے نازک پتے تیر رہے ہیں جن پر آب حوض کے قطرے جب کبھی وجد و کیف میں آکر گر پڑتے ہیں تو دن کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں جاندار موتی کنول کے پتوں پر لرز رہے ہیں اور چاندنی رات میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ تارے آسمان سے ٹوٹ کر حوض میں تیر رہے ہیں۔ حوض کے چبوترہ پر چاروں طرف چار نشستیں سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہیں۔ وسط میں ایک بڑا فوارہ اور چاروں گوشوں پر چار چھوٹے چھوٹے فوارے ہیں۔ چبوترہ کا ایک ضلع ۷۴¼ فیٹ اور حوض کا ضلع ۴۳¼ فیٹ ہے۔

حوض کے دونوں طرف دائیں بائیں فصیل سے ملی ہوئی دو سہ منزلہ سرخ پتھر کی عمارتیں ہیں۔ دونوں پر سنگ سرخ کا ایک ایک خوبصورت برج ہے جن کی چوٹیاں سنگ مرمر کی ہیں۔ مغرب رویہ عمارت میں زینہ کے پاس ہی کسی بزرگ کا مزار بنا ہوا ہے۔

اس حوض کے شمال میں سنگ سرخ کے چبوترے تک ۴۳۸¾ فیٹ فاصلہ ہے اس طرح صدر دروازہ سے اس چبوترہ تک کل فاصلہ ۹۲۵¾ فیٹ ہے۔ حوض کے بعد نہر شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں بھی فوارے لگے ہوئے ہیں۔ صدر دروازہ سے سرخ چبوترے تک نہر کے دونوں جانب سنگین راہیں بنے ہوئے ہیں۔ جن کے دونوں طرف

تین تین راستے نکالے گئے ہیں۔ ان راستوں میں بھی پتھر کی کیاریاں کٹی ہوئی ہیں۔ تاج تک پہنچنے کے لئے راستہ بھی کس قدر لطیف بنایا گیا ہے کہ یہاں سے وہاں تک سبزہ زار کے مختصر اور طویل قطعے سیاح کی نگاہ کو ایک مستقل تازگی سے ہم آغوش کر دیتے ہیں

روضہ ممتاز محل کی منزل زیریں

حوض اور دونوں نہریں طے کر کے اب ہم سنگ سرخ کے اس چبوترے پر پہنچتے ہیں جو شرقاً اور غرباً دونوں طرف فصیل سے ملا ہوا ہے۔ کل چبوترہ کا طول ۹۷۰ فیٹ ۷ انچ اور عرض ۳۶۴ فیٹ ۱۰ انچ ہے۔ چبوترہ کی بلندی سطح باغ سے ۴ فیٹ اور جمنا کے کنارے سے ½۸۲ فیٹ بلند ہے۔ اسی چبوترہ کے وسط میں سنگ مرمر کا ۲۰ فیٹ بلند چبوترہ ہے۔ جس پر اصل روضہ واقع ہے اور جنوبی سمت میں آمنے سامنے دو زینے اکیس اکیس سیڑھیوں کے خالص مرمر سے بنے ہوئے ہیں۔ ان پر چڑھنے سے پہلے سیاح و زائر احتراماً برہنہ پا ہو جاتے ہیں حصۂ زیریں میں چبوترہ پر ۱۹ فیٹ ۵ انچ چوڑا چوپڑ کا فرش ہے۔ یعنی سنگِ مرمر کے چار ٹکڑے ملا کر رکھ دیئے گئے ہیں اور اُن کے درمیان سُرخ پتھر کا ایک ایک خوشنما ہشت پہلو پھول بنایا گیا ہے۔ اس فرش کے دونوں کناروں پر جانب دریائے جمن دو زینے نیچے کی طرف گئے ہیں۔ ایک مسجد کی سمت سے اور دوسرا تسبیح خانہ کی سمت سے۔ مسجد کی جانب کا زینہ ایک تہہ خانہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو نہایت تاریک ہے۔

اسلامی عمارتوں کا ضروری عنصر

غالباً عہد مغلیہ کی کوئی تاریخی بڑی عمارت ایسی نہیں جس کے ایک حصہ میں مسجد نہ بنائی گئی ہو۔ چنانچہ مغربی گوشہ میں یہاں بھی ایک رفیع الشان

مسجد موجود ہے۔ مسجد کا چبوترہ سنگ سرخ کا ہے جو ۸۶ ۱/۲ - ۱۵ ۳/۴ فیٹ لمبا چوڑا ہے۔ تین محرابیں ہیں۔ درمیانی محراب ۲۴ ۱/۲ فیٹ اور اطراف کی محرابیں ۱۸ ۳/۴ فیٹ ہیں۔ درمیانی اندرونی محراب کے چاروں طرف "سورۂ والشمس" کندہ ہے۔ اس محراب کے بالکل درمیان میں سنگ مرمر کا ایک شفاف آئینہ لگا ہوا ہے جس میں روضہ کا عکس پڑتا ہے۔ مسجد کے دائیں کنارے پر دو کٹہرہ دار حجرے ہیں۔ ۳۰۹ ۵ خوشنما مصلے ہیں مسجد کے درمیان میں اندرونی جانب دو طغرے بشکل دائرہ بنے ہوئے ہیں۔ جن میں سورۂ "اخلاص" کندہ ہے۔ باہر کی جانب دو گول طغرے ہیں۔ جن میں ۸ جگہ "یا کافی" اور درمیانی خلا میں لفظ "اللہ" لکھا ہوا ہے۔ چھوٹے دروں پر دائیں بائیں کلمہ طیبہ کے دائرے ہیں۔ مسجد کے اندر شمالی دالانہ میں بھی دو دائرے ہیں۔ جن میں کلمہ طیبہ کندہ ہے پہلے اور تیسرے در میں آٹھ آٹھ دائرے ہیں۔ ہر دائرہ میں ۸ جگہ "یا کافی" اور درمیان میں "اللہ" لکھا ہوا ہے۔ ہر در کے دوسرے حصہ میں بھی "یا کافی" کے دائرے اور کلمہ طیبہ کے چار چار دائرے ہیں۔ یہ کل مدور طغرے طلائی بنے ہوئے ہیں۔ مسجد کی بائیں جانب سمت جنوبی باؤلی کی طرف آخری در کے پہلو میں ۸۰ سیڑھیوں کا ایک زینہ ہے جسے طے کر کے مسجد کی چھت پر جاتے ہیں۔ صحن مسجد میں ۱۶ فیٹ مربع ایک حوض بھی ہے۔ چھت کے چاروں گوشوں پر چار مثمن برج اور تین گنبد ہیں۔ ہر گنبد کا دور ۱۶۴ ۱/۲ فیٹ ہے۔

لسبتی برج

چھت سے اتر کر مسجد کی عقبی دیوار سے ملحق دائیں بائیں دونوں طرف مختصر دالان ہیں۔ ان کے زینے مسجد کی شمالی و جنوبی دیواروں میں فصیل سے ملے ہوئے ہیں۔ شمالی زینہ سے چڑھ کر لسبتی برج میں پہنچتے ہیں۔ اس برج کا ارتفاع

چبوترہ سے ۱۴۳ فیٹ ہے۔اسی برج میں ایک زینہ ہے ۔جسے طے کرکے دریائے جمن تک پہنچتے ہیں۔

تسبیح خانہ تعمیر تاج" میں چونکہ تقابل و توازن کا بے حد خیال رکھا گیا ہے اس لئے اگر مغرب کی جانب مسجد ہے تو مشرق کی جانب اس کا ویسا ہی جواب ہے۔ دو مسجدوں کا ایک جگہ ہونا مناسب نہ تھا۔اس لئے اس جواب کا نام تسبیح خانہ یا جماعت خانہ رکھ دیا۔یہ بھی بالکل مسجد جیسی عمارت ہے۔

روضہ کے برج کا عکس تسبیح خانہ کے فرش پر تسبیح خانہ کے فرش پر جانب شمال دریا کی طرف سیاہ پتھر سے روضہ کے برج کے کلس کا عکس کندہ کر دیا گیا ہے۔اس کی پیمائش سے کلس کی بلندی کا اندازہ لگائیے۔طول ½ ۳۰ فیٹ۔چاند کا قاعدہ ½ ۸ فیٹ اوپر کے لٹو کا قطر ½ ۴ فیٹ صراحی ½ ۵ فیٹ۔صراحی کے اوپر کا لٹو ¾ ۳ فیٹ۔چاند کا بیرونی دور ½ ۹ فیٹ اور قطرہ فیٹ ہے۔

مرکز نور جب ہم سرخ پتھر کا چبوترہ طے کرکے اوپر آتے ہیں۔تو ہمیں یہاں چاروں طرف ایک طوفانِ طور نظر آتا ہے۔یہیں وہ مرکز جاہ و جلال اور مخزنِ عصمت و جمال محفوظ ہے۔جہاں "شاہ جہاں" اور "ممتاز محل" (نور اللہ مرقدہما) کی ابدی خلوت گاہیں ہیں۔اس مرمریں چبوترہ کے چاروں گوشوں پر چار بلند مینار ہیں جو اپنی خوبصورتی۔نفاست۔صناعی اور تعمیر کے لحاظ سے اُن تمام میناروں سے بہتر ہیں جو ان کے علاوہ ہندوستان یا بیرون ہند میں مشہور ہیں۔ہر مینار کے ہشت پہلو چبوترے کا دور ۴۸ فیٹ ہے اور ہر مینار کے تین درجے ہیں۔ ۱۰ سیڑھیاں طے کرکے پہلے

تاج محل

درجہ پر پہنچتے ہیں۔ دوسرے درجہ پر پہنچنے کے لئے ۴۹ سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں۔ میناروں کی بلندی صحن باغ سے کلس کی چوٹی تک ½ ۱۶۲ فیٹ ہے۔ میناروں کے راستے میں کافی روشنی ہے۔ سیاح اوپر کے درجہ تک نہایت آرام سے پہنچ جاتے ہیں روضہ کے درمیانی بڑے گنبد کی کلس کی چوٹی سطح باغ سے ½ ۲۴۳ فیٹ بلند ہے یعنی قطب مینار دہلی سے ۵ فیٹ بلند ہے۔

مقبرے کی عمارت مثمن ½ ۲ فیٹ بلند چبوترے پر واقع ہے جس کے چار اضلاع بڑے اور چار چھوٹے ہیں۔ ہر بڑا ضلع ۱۲۹ فیٹ ۶ انچ اور ہر چھوٹا ضلع ۳۲ فیٹ ۶ انچ ہے۔

ہر بڑے ضلع میں ایک بڑا اور اُس کے اندر ایک چھوٹا در ہے۔ چاروں بڑے دروں کے پہلوؤں اور پیشانی پر سورۃ "یٰسین" کندہ ہے۔ صدر دروازہ کے پیش طاق پر سورۃ "تکویر" غربی دروازہ کے پیش طاق پر سورۃ "انفطار" اور آخر میں "۱۰۴۶ھ" شمالی دروازہ کے پیش طاق پر سورۃ "انشقاق" اور جنوبی دروازہ کے طاق پیشین پر سورۃ "مبینہ" کندہ ہے۔

مقبرہ کے صدر دروازہ کی دہلیز $\frac{5}{12}$ ۴۲ × $\frac{7}{12}$ ۲۵ فیٹ ہے۔ چار چھوٹے اضلاع پر چار ہشت پہلو مثمن و مربع کمرے ہیں۔ ہر کمرہ کا قطر ۲۶ فیٹ ۸ انچ ہے۔ بڑے چار اضلاع پر چار قائمۃ الزاویہ اور ذوار بعۃ الاضلاع کمرے ہیں۔ ہر کمرہ ۱۵ فیٹ ۱۱ انچ مربع ہے۔ ہر کمرہ کے برآمدہ کا طول ۱۶ فیٹ ۴ انچ ہے۔ یہ کمرے اور برآمدے اس ترتیب سے بنے ہوئے ہیں کہ دروازہ میں داخل ہوتے ہی پہلے مربع کمرہ میں پہونچتے ہیں۔ پھر کسی طرف کا ایک برآمدہ ملتا ہے۔ پھر مثمن کمرہ، پھر برآمدہ پھر مربع کمرہ۔ اس طرح

مثمن کمروں، چار مربع کمروں اور آٹھ برآمدوں کا دور پھر دروازہ پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔
اس عمارت یا مقبرہ کے آئینہ تمثال در و دیوار سنگتراشی کے اُس کمال کی زندہ مثالیں
ہیں جو آج دُنیا سے اور خصوصاً مسلمانوں سے فنا ہو چکا ہے۔ صنعتی محاکات، پتھر کو
پانی کی طرح موڑ دینا۔ پھولوں کی رگوں کے ابھار سے پتیوں کو منقسم کر دینا۔ کلیوں کی
دوشیزگی نمایاں کرنا۔ بادی النظر میں انسان کا کام معلوم نہیں ہوتا۔ اس عمارت میں
وہ تمام صناعیاں، وہ تمام کمالات اور وہ تمام فنی باریکیاں ختم کر دی گئی ہیں جن کی
وجہ سے "تاج محل" ہفت عجائبات میں سے ایک تسلیم کیا جاتا ہے۔

یہ سنگتراشیوں کا محشر رعنا، یہ دستکاریوں کا محشر خاموش، یہ پچی کاریوں کا سیلاب
ساکن۔ صناعین کے قادرانہ کمال اور بانی کی شعریت مآب ذہنیت کا ایک ہمیشہ زندہ
رہنے والا مظاہرہ۔ گویا ہے جس نے مسجد قرطبہ۔ قصر الزہرا۔ قصر الحمرا۔ قصر الحائر۔ قصر السرور
قبتہ الخضرا، قصر الخلد، قصر الذہب، رشیق اور دار الشجرہ جیسی عالم فریب عمارتوں پر بھی
اپنی اکملیت کے لحاظ سے تفوق حاصل کر لیا ہے۔

یہ درجہ جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں مثمن مُستطیل ہے۔ اس کا ہر ضلع ۲۴ فیٹ ۲ اینچ ہے
ان چار دروں میں جو چاروں گوشوں پر واقع ہیں۔ مربع جالیوں کے اندر ۸۰ آئینے لگے
ہوئے ہیں۔ اسی طرح شمال مشرقی اور غربی جانب کے ہر در میں ۷۴۴ آئینوں کی جالیاں
لگی ہوئی ہیں۔ جنوبی سمت کے دروازہ میں جو آمد و رفت کا دروازہ ہے ۶۶۲ آئینے ہیں غرضیکہ
یہ کمرہ ۲۲۲۰ آئینوں سے ایک حیران کن آئینہ خانہ بن گیا ہے۔ اس کمرہ کا قطر ۵ فیٹ
ہے اور اندرونی جانب سے ۸۰ فیٹ مرتفع ہے۔ کمرہ کے گرد اگرد حلقوں میں آیات
قرآنی کندہ ہیں۔ حلقۂ بالا میں سورۂ "الملک" کندہ ہے جو دوسرے در کی نصف محراب

شرقی کے حلقۂ زیریں میں ختم ہوتی ہے۔ وہاں سے سورۂ والفتح شروع ہوکر چھتے در کے نصف حصہ میں ختم ہوئی ہے۔ پھر ایک آیت قرآن کندہ کرنے کے بعد کتبہ فقیر الحقیر امانت خاں شیرازی فی ۱۰۴۸ھ ہزار و چہل و ہشت ہجری ۱۲ سنہ دوازدہم بجلوس مبارک کندہ ہے۔ تمام روضہ میں قرآن شریف کی ۱۴ سورتیں کندہ ہیں۔

کمرہ کے وسط میں سنگ مرمر کی نفیس جالیوں کا ایک مثمن محجر ۶ فیٹ ۲ انچ بلند ہے۔ اس مثمن کا ہر ضلع ۱۲ فیٹ ۲ انچ ہے۔ ہر ضلع میں تین تین جالیاں ہیں اور ہر جالی $4\frac{5}{12} \times 3\frac{1}{2}$ فیٹ ہے۔ شمالی جانب کا در ایک ہی بڑی جالی سے بند ہے اور جنوبی سمت کا دروازہ زائرین کے لئے کھلا ہوا ہے۔ ان دونوں دروازوں کی بلندی اور چوڑائی $8\frac{1}{2} \times 3\frac{1}{2}$ فیٹ ہے۔ یہاں جو سنگ مرمر کام میں لایا گیا ہے۔ وہ بے حد نفیس اور بیش بہا ہے۔ روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درو دیوار سونے کے بنے ہوئے ہیں یا سنگ مرمر میں طلا کو ممزوج کر دیا گیا ہے۔ دونوں دروں کی اندرونی و بیرونی پیشانی پر نازک طلائی بیلیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک فضائے نور پر چودھویں کے چاند کی سنہری کرنیں جذب ہوکر رہ گئی ہیں۔

محجر کے ہر گوشہ پر سنگ مرمر کی کلسیاں ہیں۔ یہاں نہایت نفیس پچیکاری ہے آرٹ اور شعریت کا امتزاج ہے۔ ایک ایک پھول میں صدہا مختلف قسم کے قیمتی اور خوش رنگ پتھروں کے جوڑ دیئے گئے ہیں اور جوڑ کہیں معلوم نہیں ہوتا۔ یہ مقام محاکات تعمیر کا بہترین مظہر ہے۔

بالائی محجر کے اندر

محجر شمالاً اور جنوباً ۱۸ فیٹ ۷ انچ اور غرباً شرقاً ۸ فیٹ ۱۰ انچ ہے۔ وسط میں ممتاز الزمانی بیگم کی

قبر کا تعویذ ہے جس کے ابعاد ثلاثہ ۶ ۷/۱۲ × ۱ ۷/۱۲ × ۲ ۲/۱۲ فیٹ ہیں۔ چبوترہ کا عرض وطول اور بلندی ۱۰ ۲/۳ × ۶ ۲/۳ × ۱ ۳/۴ فیٹ ہے۔ لوح مزار پر سنگ موسیٰ سے تراشے ہوئے الفاظ میں عربی کتبہ کندہ ہے اور پائیں مزار تعویذ پر "مرقد منور ارجمند بانو بیگم مخاطب بہ ممتاز محل توفیت فی سنہ ۱۰۴۰ھ" لکھا ہوا ہے۔

اسی قبر کے پہلو میں صاحب قران شاہ جہان بادشاہ غازی کی لوح مزار ہے۔ شب دوشنبہ کو جب صاحبقران نے وفات پائی تو گو ان کی وصیت مہتاب باغ میں دفن ہونے کے لئے تھی مگر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے بعض مصالح مذہبی کی بنا پر وصیت کی تکمیل نہ کی اور اپنے مقدس باپ کو اپنے محترم ماں کے جوار ہی میں دفن ہونے کا حکم دیا۔ صاحب قران کے مزار کا تعویذ جانب دیوار مجر سے ملحق ۷ ۲/۱۲ × ۳ ۱/۴ × ۲ ۲/۳ فیٹ ہے۔ تعویذ پر ایک قلمدان ۱ ۱/۴ فیٹ طویل بنا ہوا ہے دونوں قبروں میں صرف ۸ انچہ کا فاصلہ ہے۔ تعویذ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے "مرقد مطہر اعلیٰ حضرت فردوس آشیانی صاحب قران ثانی شاہ جہان بادشاہ طاب ثراہ سنہ ۱۰۷۶ھ"

اصلی مزار غلام گردش کے وسط میں ایک تہہ خانہ کا زینہ ہے۔ اس کا دروازہ ۷ ۱/۴ × ۴ فیٹ بلند ہے۔ تہہ خانے کا کمرہ ۲۶ ۲/۳ × ۲۲ ۲/۳ فیٹ ہے۔ وسط میں ممتاز محل کا اصلی مزار اور اسی کے پہلو میں شاہ جہان کا اصلی مدفن ہے۔ یہاں بھی مزار ممتاز محل پر خدا کے ۹۹ نام اور عربی عبارت کندہ ہے جو اوپر لکھی جا چکی ہے لیکن شاہ جہان کے اصلی مدفن پر جو عبارت کندہ ہے۔ وہ اس سے متغائر ہے جو مثالی تعویذ پر بالائی مجر میں لکھی ہوئی ہے۔ اصل قبر کی تعویذ پر یہ عبارت کندہ ہے :-

اندرونی منظر
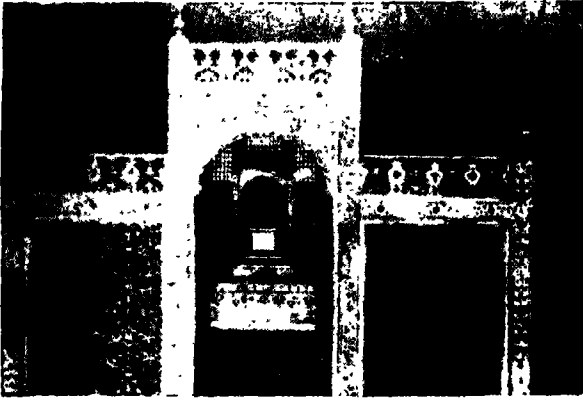
تاج جمنا کے کنارے

"مرقد منور و مضجع مطہر بادشاہ رضوان دستگاہ خلد آرام گاہ۔ اعلحضرت علیین مکانی فردوس آشیانی صاحبقران ثانی شاہ جہان بادشاہ غازی طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ در شب بست و ششم شہر رجب سنہ یک ہزار و ہفتاد و شش ہجری از جہان فانی بہ نزہت گاہ جاودانی انتقال کردند۔"

گنبد تاج

چھت کے وسط میں عظیم الشان گنبد ہے۔ اس کا چبوترہ کا دور ۱۶ حصوں پر منقسم ہے۔ ہر حصہ ۱۹ فیٹ ہے اور حلقہ کا دور ۲۷۴ فیٹ ہے۔ گنبد پر ملمع کاری ہوئی ہے۔ گنبد کے چاند میں کلمہ طیبہ کندہ ہے۔ کلس ۲۳ من وزنی ہے۔ چھت کے چاروں گوشوں پر چار گنبد اور ہیں جن کے آٹھ آٹھ در ہیں۔ چھت کے چاروں طرف مختصر برآمدے ۴ ½ فیٹ لمبے بنے ہوئے ہیں ان میں نو نو در ہیں۔ آٹھ گلدستے بھی چھت پر نصب ہیں۔ غلام گردش سے دو زینے چھت پر جاتے ہیں اور پہنچنے کیلئے ۴۶ سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں۔

شاہ جہان کی حسرت ناتمام

غفران مآب اعلیٰ حضرت شاہ جہان (قدس سرہ العزیز) کا ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ وہ بھی تاج محل کے مقبرہ میں دفن کئے جائیں اور ایک شہنشاہ کے لئے مناسب بھی یہی تھا کہ اُس کا مقبرہ علیحدہ تیار کیا جائے۔ اگر ایسا خیال ہوتا تو ممتاز الزمانی بیگم کی قبر مطہر کے بالکل وسط میں نہ بنوائی جاتی بلکہ ایک قبر کی جگہ چھوڑ کر بنائی جاتی۔ دراصل شاہ جہان کی تمنا یہ تھی کہ وہ "تاج" کے عین مقابلہ میں دریا کے دوسرے کنارے پر اپنے لئے ایک اور شاندار روضہ مہتاب باغ میں تعمیر کرائے اور دونوں مقابر سنگ مرمر کا پل بنا کر آپس میں ملا دیئے جائیں تا کہ زائرین کو ایک روضہ سے دوسرے روضہ تک

جانے میں سہولت ہو۔

ظاہر ہے کہ شاہ جہان کا یہ خیال کس درجہ شعریت لئے ہوئے تھا۔ تصور کیجئے کہ دریا کے دونوں کناروں پر بالمقابل دو شاندار عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ بیچ میں سنگ مرمر کا پل ہے۔ نیچے مقدس جمنا بہ رہی ہے۔ کیا اس عجیب وغریب منظر کا کوئی جواب ہو سکتا تھا؟ شاہجہان نے اپنے خیال کو عمل میں لانے کی کوشش بھی شروع کر دی تھی۔ دریا کے دوسرے کنارے پر روضۂ شاہجہانی کی اساس بھی پڑ چکی تھی جس کے آثار اب تک باقی ہیں لیکن افسوس کہ تقدیر میں کامیابی نہ تھی۔ دفعتۃً شہزادوں میں لڑائی چھڑ گئی۔ ملک اورنگ زیب کے قبضہ میں چلا گیا۔ شاہ جہان ترک سلطنت کر کے قلعہ نشین ہو گئے۔ اور مہتاب باغ کی یہ نورانی تعمیر ذہن سے زمین پر منتقل نہ ہو سکی۔

امتیازی ارتفاع

"تاج" ایک ایسی مرتفع زمین پر تعمیر کیا گیا ہے کہ آگرہ کے کسی حصہ میں اس سے زیادہ بلند کوئی عمارت نہیں ای۔ آئی ریلوے کے مسافروں کو اعتماد پور ہی سے "تاج" نظر آنے لگتا ہے۔ دریائے جمن کے ہر کنارے سے منظر تاج نمودار ہو جاتا ہے اور ادھر قلعہ کے امر سنگھ دروازہ سے اس کا بلند گنبد نظر آنے لگتا ہے۔ گو تاج کا یہ ارتفاع اسے اپنے قریب وبعید ماحول میں ممیز کئے ہوئے ہے۔ لیکن اس نموداری اور "صفت نظر" ہونے سے ان لوگوں کے اشتیاق کو جن کی نگاہ وشوق نے کبھی اس کا مشاہدہ نہیں کیا اور جو اس کی زیارت کے لئے یورپ اور امریکہ تک سے آگرہ آتے ہیں۔ اس کی یہ ارتفاعی خصوصیت یک وقت کسی قدر کمزور کر دیتی ہے جس کے ذمہ دار صرف اس کی تعمیری سربلندی اور بالانشینی ہے۔

آداب تاج

"تاج" سیاحوں کے لگاہوں کو کامیاب تماشہ بنانے کے لئے صبح سے رات کے بارہ بجے تک کھلا رہتا ہے۔ دس بجے سے صدر دروازہ بند ہو جاتا ہے مگر کھڑکی کھلی رہتی ہے۔ دس بجے کے بعد جو سیاح یہاں آتے ہیں۔ اُن سے ایک کتاب پر دستخط لئے جاتے ہیں اور بارہ بجے کے بعد وہاں کسی کو اذن سیر نہیں ہوتا۔ مزامیر کی قسم سے کوئی چیز اندر نہیں جاتی اور نہ قومی یا مذہبی جلسوں کے لئے اجازت دی جاتی ہے۔ شور و غل کرنے کی بھی ممانعت ہے

تاج کی نگہداشت

"تاج" کی نگہداشت گورنمنٹ کے آرچی لوجیکل ڈپارٹمنٹ کے سپرد ہے جس کی طرف سے ایک معقول عملہ صفائی۔ دیکھ بھال۔ آبیاری اور حفاظت کے لئے شب و روز مامور رہتا ہے مالی۔ فراش، خدام سب حکومت کی طرف سے مقرر ہیں جو روز "تاج" اور اُس کے ملحقہ باغوں عمارتوں اور سبزہ زار وغیرہ کی نگہداشت کرتے ہیں۔ اس خصوص میں حکومت قابل شکریہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مسلمانوں کی موجودہ مجہولیت خدا جانے اُس "فردوس ارضی" کو کیا بنا دیتی۔

سیماب

از پیمانہ تاج محل نمبر نومبر ۱۹۳۰ء

(بہ اجازت خاص)

آسودگانِ تاج

شہاب الدین محمد شاہ جہان صاحب قران ثانی

وفات	تخت نشینی	پیدائش
۱۰۷۶ھ	۱۰۳۷ھ	۹۹۹ھ
۱۶۶۶ء	۱۶۲۸ء	۱۵۸۹ء

سلطنت مغلیہ کا یہ پانچواں تاجدار شہنشاہ جہانگیر کا تیسرا فرزند تھا۔ عالم طفولیت وشاہزادگی میں اس کو خرّم کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ خرم کے تین اور بھائی تھے۔ خسرو اور پرویز اس سے بڑے تھے اور شہریار چھوٹا۔ بچپن ہی سے خرم کا اٹھان کہہ رہا تھا کہ ہندوستان کے تخت کو اسی شہزادے کے قدموں سے زینت ملے گی۔ کیونکہ خسرو اور پرویز دونوں عیش وآرام کے بندے اور امور سلطنت سے غافل تھے لیکن خرّم

نے علاوہ امورِ سلطنت میں حصّہ لینے کے میواڑ اور دکن کی مہموں میں بہت بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اُدے پور کو جسے اس کا دادا اکبر بھی فتح نہ کر سکا تھا اس نے اپنے حسنِ تدبیر سے فتح کر لیا۔ احمد نگر کو بھی اسی شاہزادہ نے فتح کیا۔ نہ صرف شہنشاہ جہانگیر بلکہ ملکہ نور جہاں (جو شاہزادہ کی سوتیلی ماں تھی) شاہزادہ کو بہت چاہتی تھی اور اسی محبت کی وجہ سے اس نے اپنے بھائی آصف خان (جو سلطنت کا وزیرِ اعظم بھی تھا) کی بیٹی سے اس کی شادی بھی کر دی۔ جہانگیر اس کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھاتا تھا۔ شاہزادہ کو تیس ہزاری منصب کے علاوہ دکن اور گجرات کی صوبہ داری بھی حاصل تھی۔

سنہ ۱۶۲۱ء تک تو حالات خرم کے موافق رہے۔ لیکن اس سال جب خسرو (جو شاہزادہ کا بڑا بھائی تھا) کا انتقال ہو گیا تو یہ گمان ہونے لگا کہ اس کی موت میں شاہزادے کا ہاتھ ہے۔ اتفاق سے اس سال ایرانیوں نے قندھار پر قبضہ کر لیا تو نور جہاں نے جہانگیر کو رائے دی کہ شاہزادے کو ایرانیوں کے خلاف مہم پر بھیجا جائے۔ شاہزادے نے بھانپ لیا کہ اب نور جہاں اس کو ہٹا کر اپنے داماد شہریار کو تخت دلانا چاہتی ہے۔ شہریار جہانگیر کا چوتھا فرزند اور نور جہاں کا داماد تھا۔ اس کی شادی نور جہاں کی لڑکی سے ہوئی تھی جو اس کے پہلے شوہر شیر افگن سے تھی۔ شاہزادے نے دکن چھوڑ کر قندھار جانے سے انکار کر دیا۔ اسکے اس انکار کو بغاوت سے تعبیر کرتے ہوئے نور جہاں نے جنرل مہابت خاں کی ماتحتی میں ایک بڑی فوج روانہ کی۔ شاہزادے کو ان لڑائیوں میں شکست ہوئی۔ اس نے بھاگ کر مچھلی بندر میں پناہ لی اور یہاں سے بنگالہ چلا گیا۔ بنگالہ سے اس نے الہ آباد پر چڑھائی کی برہان پور کے پاس مہابت خاں سے جنگ ہوئی جس میں شاہزادے کو شکست فاش ہوئی اور یہ پھر دکن کو فرار ہو گیا۔ مہابت خاں اس کے تعاقب میں تھا۔ مجبور ہو کر شاہزادے نے اپنے باپ شہنشاہ جہانگیر سے معافی مانگی۔ یہ معافی اس شرط پر

دی گئی کہ شاہزادہ اپنے دو بیٹوں کو بطور ضمانت دیتے ہوئے تمام قلعوں کو شاہی فوج کے حوالے کر دے۔ شاہزادے کی تمام جاگیریں شہریار کو دے دی گئیں۔ شاہزادہ بالکل بے یار و مددگار ہو کر دکن اور سندھ میں پناہ کی تلاش میں پھرتا رہا۔

جنرل مہابت خان ان فتوحات سے فارغ ہو کر جب دربار میں پہنچا۔ تو یہاں نورجہاں نے اس کے سامنے تجویز پیش کی کہ جہانگیر کے بعد شہریار کو تخت دیا جائے مفادِ سلطنت کا لحاظ کرتے ہوئے سلطنت مغلیہ کے اس سب سے بڑے جنرل نے اس تجویز کو ٹھکرا دیا۔ نورجہاں اس کی دشمن ہو گئی۔ جہانگیر سے شکایت کی کہ مہابت خان نے دکن اور بنگالہ کی مہموں میں سرکاری روپیہ خرد برد کر لیا ہے۔ جہانگیر اس وقت کابل جا رہا تھا۔ مہابت خاں کو جواب دہی کے لئے طلب کیا۔ مہابت خان کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے خلاف سازش کا جال بچھ چکا ہے۔ یہ موقعہ کی انتظار میں تھا۔ ایک دن جب شہنشاہی لشکر اور نورجہان، جہانگیر سے علیحدہ تھے تو اس نے چھاپہ مار کر شہنشاہ کو قید کر لیا۔ نورجہاں نے اس کی رہائی کی کوشش کی۔ جنگ میں نورجہان کو شکست ہوئی۔ اس کو بھی قید کر لیا گیا۔ مہابت خاں، شہنشاہ اور بیگم دونوں کو لے کر کابل پہنچا۔ ان سے نہایت احترام اور عزت کا سلوک کیا جاتا تھا۔ کابل پہنچ کر نورجہان نے خفیہ طور پر مہابت خان کے خلاف پھر سازشیں شروع کر دیں۔ ان میں وہ کامیاب ہو گئی۔ یہ دیکھ کر مہابت خاں شہنشاہ سے معافی کا طلبگار ہوا۔ نورجہاں نے اس شرط پر معافی دینی چاہی کہ مہابت خان اپنی فوجوں سے شاہزادہ خرم کا قصہ پاک کرے۔ شاہزادہ اس وقت دکن میں تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ہندوستان چھوڑ کر براہِ سندھ ایران چلا جائے۔ مہابت خان دکن پہنچا اور شہزادے سے مل گیا۔ نورجہان کو جب

خبر پہنچی تو اُس نے مہابت خاں کے سر کے لئے انعام مشتہر کیا۔ مہابت خاں کے آکر مل جانے سے شاہزادے کی ڈھارس بندھی اور اسی زمانہ میں یہ خبر بھی ملی کہ پرویز جو شاہزادے کا بڑا بھائی تھا۔ اس کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔

نورجہاں، مہابت خاں اور شاہزادے کے خلاف مہم تیار کر رہی تھی کہ اتفاق سے جہانگیر یکایک بیمار ہو گیا اور لاہور میں انتقال کیا۔ وزیراعظم آصف خان (جو نورجہان کا بھائی اور شاہزادے کا خسر تھا) یہ نہیں چاہتا تھا کہ شہریار تخت نشین ہو۔ اس نے مصلحتِ وقت کے لحاظ سے فوراً ہی لاہور میں خسرو کے بیٹے داور بخش (بلاقی) کی تخت نشینی کا اعلان کردیا (اور ساتھ ہی خفیہ طور پر دکن میں شاہزادہ خرم کو لکھ بھیجا کہ جلد سے جلد دہلی پہنچ جائے) ادھر نورجہان نے شہریار کی تخت نشینی کا اعلان کیا۔ جنگ چھڑ گئی۔ آصف خاں نے شہریار کو شکست دیتے ہوئے نورجہان کو نظر بند کر دیا۔ اب شاہزادے کے لئے تخت حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ داور بخش اور شہریار دونوں کو مار دیا گیا۔ شاہزادہ ۱۶۲۸ء میں دہلی پہنچ گیا اور شاہ جہاں کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ ملکہ نورجہاں کو پچیس لاکھ سالانہ پنشن دی گئی جس کے بعد وہ سیاست سے دست بردار ہو کر شاہی محلوں میں عزت و احترام کی زندگی بسر کرنے لگی۔

شاہ جہان کو تخت نشین ہوئے تین ہی سال گذرے تھے کہ اس کی عزیز ملکہ ممتاز محل جو اس کی تمام صحرا نوردی اور مصیبتوں میں ساتھ دی انتقال کر گئی۔

شاہ جہان کا عہد زیادہ تر عمارتوں کے لئے مشہور ہے اور یہ بالکل سچ ہے کہ اگر شاہ جہان سا بادشاہ سلطنت مغلیہ کو نہ ملتا تو آرٹ اور تعمیر کے لحاظ سے مغلیہ

سلطنت کا صفحہ بالکل خالی رہتا۔ اس شہنشاہ نے علاوہ تاج محل کے لال قلعہ۔ دیوان خاص۔ جامع مسجد۔ موتی مسجد اور متعدد دوسری عمارتیں بنائیں جو خوبصورتی کے لحاظ سے بے نظیر مانی جاتی ہیں۔ مشہور عالم تخت طاؤس بھی اسی شہنشاہ نے بنوایا تھا۔

بائیس سال کی پرامن اور کامیاب حکومت کے بعد شاہ جہان بیمار رہوا۔ جب یہ خبر پھیلی تو اُس کے چاروں بیٹوں (دارا۔ شجاع۔ اورنگ زیب اور مراد) میں تخت کے لئے جنگیں شروع ہو گئیں۔ ان جنگوں میں اورنگ زیب کامیاب ہو گیا۔ دوسرے تین مارے گئے۔ شاہ جہان کو آگرہ میں نظر بند کر دیا۔ لیکن اس کی عزت و احترام اسی طرح برقرار رکھے گیا۔ آٹھ سال کی نظر بندی کے بعد بالآخر ۲۱ رجب ۱۰۷۶ھ کو اُس نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ گو اس نے مہتاب باغ میں اپنا مدفن تجویز کیا تھا۔ لیکن اورنگ زیب نے یہی مناسب سمجھا کہ تاج محل جیسے دنیا کے بے نظیر و خوبصورت مقبرے میں جہاں اس کی عزیز ماں آرام فرما تھی۔ باپ بھی دفن ہو۔

شاہ جہان کی تاریخ وفات "صاحب عالمگیر نامہ" نے کہی ہے۔

چوں شاہ جہان خدیو قدسی ملکات
برخاست بہ عزم عقبیٰ از تخت حیات
جستم از عقل سال تاریخش را
گفتا خردم "شاہ جہان کرد وفات"
۱۰۷۶ھ

ملکہ ارجمند بانو بیگم (ممتاز محل)

پیدائش	وفات
سنہ ۱۰۰۳ھ	سنہ ۱۰۴۰ھ

ہندوستان کی یہ نامور ملکہ اور شہنشاہ شاہ جہان کی بیگم کا نام ارجمند بانو تھا ارجمند بانو، شہنشاہ جہانگیر اور شاہ جہان کے وزیر اعظم آصف خاں کی لڑکی تھی جو ملکہ نور جہان کا حقیقی بھائی تھا۔ ارجمند بانو کی والدہ کا نام دیوانجی بیگم تھا۔

ارجمند بانو کی پیدائش سنہ ۱۰۰۳ھ میں ہوئی۔ اپنی پھوپھی ملکہ نور جہان کے سایۂ عاطفت میں شاہی محلوں میں پل کر جوان ہوئی۔ نور جہان کی کوشش سے ہی شہنشاہ جہانگیر نے اپنے فرزند شاہ جہان سے اس کی منگنی کر دی۔ اس وقت ارجمند بانو کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔ شادی اعتماد الدولہ کے محل میں ہوئی۔ جہانگیر نے اپنے بیٹے کے سر پر موتیوں کا سہرا خود اپنے ہاتھ سے باندھا۔ پانچ لاکھ کا مہر باندھا گیا۔ شادی کے بعد شہنشاہ نے بہو کو "ممتاز محل" کا خطاب دیا۔

ممتاز محل سے شادی ہونے سے پہلے شاہ جہان کی شادی قندھاری بیگم سے ہو چکی تھی۔ لیکن ممتاز محل نے حرم شاہی میں آنے کے بعد ہی وہ درجہ حاصل کر لیا۔ جو نور جہان کو جہانگیر کے حرم میں تھا۔ شاہ جہان کو ممتاز محل پر کامل اعتماد تھا اور بغیر ممتاز محل کے مشورے کے وہ کوئی کام سرکاری یا غیر سرکاری نہیں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ شاہ جہان تخت نشین ہوا تو شاہی مہر بھی ممتاز محل کے سپرد کر دی گئی اور بغیر بیگم کے دیکھے ہوئے سلطنت میں کوئی فرمان جاری نہیں ہوتا تھا۔

نورجہاں کی سازشوں سے شاہ جہان اپنی جان بچاتا ہوا جب تلنگانہ۔ بنگالہ۔ سندھ اور دکن میں بھاگتا پھر رہا تھا تو اس صحرا نوردی اور غربت کے عالم میں ممتاز محل نے بھی نہایت جوانمردی اور صبر و استقلال سے اپنے شوہر کا ساتھ دیا اور جلاوطنی کی تمام آفات و مصائب کو برداشت کیا۔

جہانگیر کے انتقال کے بعد جب شاہ جہان تخت نشین ہوا تو ممتاز محل ہندوستان کی ملکہ بنی۔

ممتاز محل خوبصورتی میں نورجہاں سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ نہایت ہی رحم دل اور غریب پرور تھی۔ اکثر غریب ملزموں کو روپیہ دے کر قرض خواہوں کے پنجوں سے رہا کراتی تھی۔ تخت نشینی کے بعد اس نامور ملکہ کو بہت زیادہ مہلت نہیں ملی۔ شاہ جہان جب سنہ ۱۶۲۹ء میں خان جہان لودھی کی سرکوبی کے لئے دکن گیا تو ملکہ بھی ساتھ تھی۔ وضع حمل کے دن قریب تھے۔ دردزہ ہوا۔ لڑکی پیدا ہوئی لیکن ملکہ جانبر نہ ہو سکی۔ ملکہ کی وفات سنہ ۱۰۴۰ھ مطابق سنہ ۱۶۲۹ء برہان پور میں ہوئی۔ ملکہ کے بطن سے شاہ جہان کی چودہ اولادیں ہوئیں جن میں دارا۔ شجاع۔ اورنگ زیب اور مراد لڑکوں میں اور جہان آرا اور روشن آرا لڑکیوں میں تاریخ میں مشہور ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بیگم نے اپنے اخیر وقت بستر مرگ پر اپنے تاجدار شوہر کو دو وصیتیں کی تھیں۔ ایک وصیت یہ تھی کہ وہ عقد ثانی نہ کرے کیونکہ خدا نے اس نوزائیدہ لڑکی کو ملا کر چودہ اولادیں دی ہیں جو نسل جاری رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ بیگم نے یہ بھی کہا کہ جب دوسری بیوی آئے گی تو اولاد پر مہر و محبت باقی نہ رہے گی۔ دوسری وصیت یہ تھی کہ جہاں تک امکان میں ہو۔ اس کا مقبرہ خوبصورت بنایا جائے۔ شاہ جہان نے بیگم

کی دونوں وصیتوں پر عمل کیا اور "تاج محل" اسی دوسری وصیت کی تعمیل ہے۔

ملکہ کی وفات دکن میں دریائے تاپتی کے کنارے شہر برہان پور میں، ۱۷ ذی قعدہ سنہ ۱۰۴۰ھ شب چہارشنبہ کو ہوئی۔ بیگم کی عمر اس وقت ۳۷ سال کی تھی۔ بے بدل خان نے تاریخ لکھی ہے۔

زیں جہاں رفت چو ممتاز محل   در جنت بہ رخش حور کشاد
بہر تاریخ ملائک گفتند   جائے ممتاز محل جنت باد
۱۰۴۰ھ

ممتاز محل کی نعش عارضی طور پر باغ زین آباد میں دفن کر دی گئی۔ جہاں سے چھ ماہ بعد آگرہ منتقل کی گئی اور تاج محل میں دفن کی گئی۔